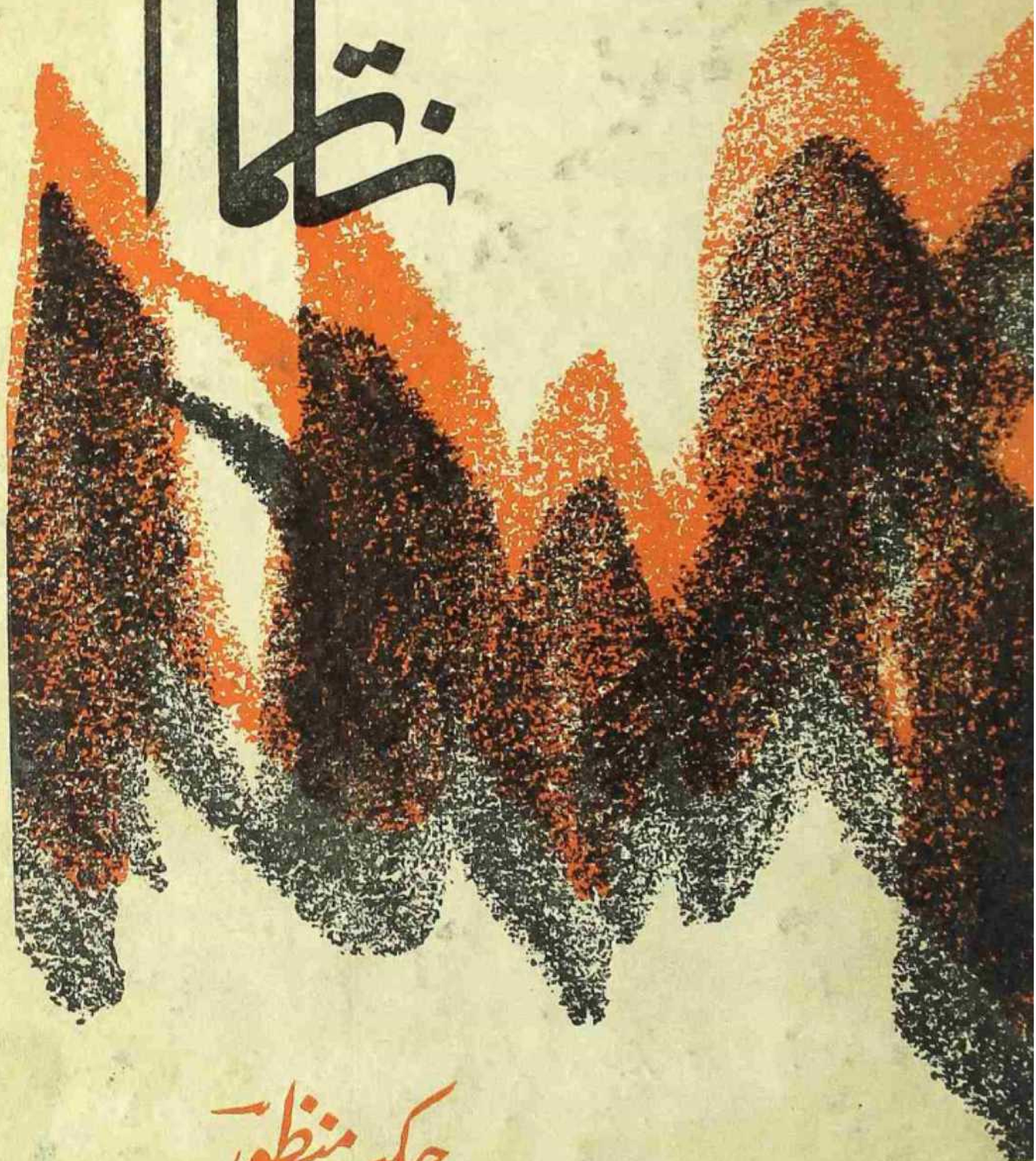
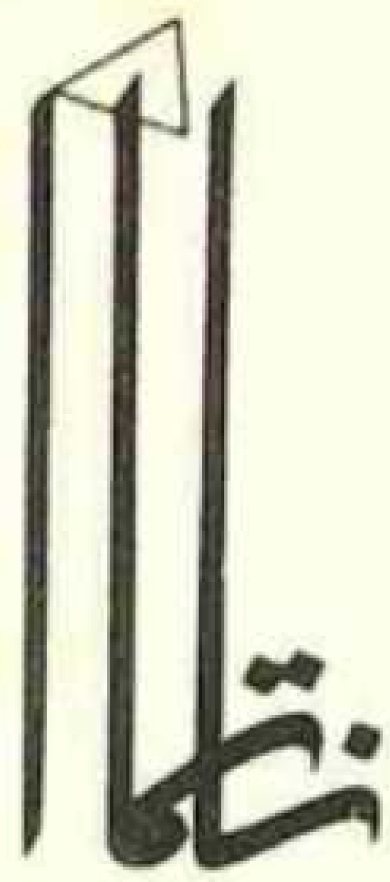


حکیم منظور





حکیم منظور

شاعر ـــــ حکیم منظورؔ

نام ـــــ محمد منظور

ولادت ـــــ ۱۷۔ جنوری ۱۹۳۷ء

مقام ـــــ سرینگر

شغل ـــــ سرکاری ملازمت

پتہ : ۱۶۔ برک کاٹیج، کوچہ سمندر خاں، جموں توی (جموں کشمیر)



انتخاب : بانی

تزئین : بھنوٹ

خوشنویس : منّان

طبع اوّل ـــــ : ۱۰۰۰

ماہ و سالِ اشاعت ـــــ : دسمبر ۱۹۷۷ء

مطبع ـــــ : جے، کے آفیسٹ پریس، جامع مسجد، دہلی ۶

قیمت ـــــ : ۱۵ روپے

ناشر : سمت نامہ پبلی کیشنز، ۲/۴۸ راجندر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۰

والدِ محترم

# الحاج قبلہ حکیم علی محمد صَاحب

کے حضور میں جن سے مجھے پدرانہ شفقت کے ساتھ ساتھ دوستانہ
محبّت بھی ملی؛ جن سے میں نے راہ اور روشنی پائی

اور

میاں جگنو کے نام
جو میری آنکھوں کی روشنی ہے۔

عزیز دوست، محمد یُوسف ٹینگ صاحب کی
نذر، جو میرے شعری سفر کے محرک اور تخلیقی
تجربوں کے رمز آشنا ہیں۔

# دیباچہ

آج کی غزل بیشتر انقطاعِ روایت کی حامل ہے۔ پیشتر جو توجہ الفاظ و اسلوب کی مرصّع سازی اور خیالات و جذبات کی تہذیب پر صرف ہوتی تھی، اب نئی شاعری کے ایک نام نہاد وصف 'کھُردرے پن' کی نذر ہو رہی ہے۔ کھُردرے پن کو نئی شاعری کے عالموں نے وہ اعتبار بخشا کہ اس نے خام ذہنوں کے لئے ایک رُجحان کی صورت اختیار کر لی۔ افکار و خیالات کی تہذیب تصنّع قرار پائی۔ 'بے روک اظہار' اور محض بشارت اہم ٹھہرے۔ نئے کے شوقِ فضول میں اُن الفاظ اور اُمور پر توجہ صرف کی جانے لگی جو محض اجنبی کے معنوں میں نئے تھے۔ نتیجتاً "معمولات" اور "معمولی" موضوعِ سخن ٹھہرے اور ان میں بھی اہمیت ایسے اشعار و افکار کو ملی جو مغرب کے نئے پُرانے رجحاناتی لیبلوں کے تحت درج ہو سکتے تھے۔ بے ہنری ہنر قرار پائی۔ اس افراط و تفریط میں کسی واقعی اچھے کلام کا میسر آنا مستثنیات میں سے ہے۔ میرے خیال میں حکیم منظور کے زیرِ نظر مجموعہ "ناتمام"

کو بھی مستثنیات ہی میں شمار کرنا چاہیئے۔

"ناتمام" کے مطالعہ سے جو فوری تاثر پیدا ہوتا ہے، وہ یوں ہے: یہ بنیادی طور پر روایت سے انحراف کی نہیں، روایت میں توسیع کی شاعری ہے؛ کہ یہ معمولات اور معمولی سے صرفِ نظر کرتی ہے۔ اِس کی لَے غزل اور مروّجہ غزل کی لَے سے مختلف ہے۔ اس لئے کہ اس کے خالق نے اپنی فکر اور اسلوب کو کسی معیاری اقدارِ شاعری کا تابع نہیں کیا۔ شاعر یا نیا شاعر بننے کے لئے تنہائی، پسپائی، مایوسی، موت جیسے خارجی اور لیبلی احساسات کو اپنی توجہ کا مرکز نہیں بنایا۔ عصری آگہی کے اخباری اظہار اور سکہ بند ذخیرۂ الفاظ سے بھی احتراز کیا ہے۔ اس نے اپنی ذات کی ترسیل کے لئے ایک اپنی راہ نکالنے کی سعی کی ہے۔ اِس سے اُس کے رویّے کی سلامت روی مترشّح ہے۔ یہ سلامت روی اپنی جگہ اخبار اور اشعار کی شعوری اور واضح تمیز پر دال ہے۔ یہ شاعر کی فکر و فن سے گہری وابستگی کا آئینہ بھی ہے۔

منظور کی غزلیں نئی غزل کی اچھی مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ نئے احساس کی حامل ہیں۔ اس نئے احساس کے رشتے منظورؔ کے اسلوب اور افکار دونوں میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ غزل کی لَے کی طرح، اُس کی فکری سطح بھی مختلف ہے۔ فکر آفرینی کے رشتے سے اُس کے افکار کا سلسلہ وسیع ہے۔ یہ وسعت اور کشادگی کشمیر کے ماحول میں پیوست انسلاکات اور تلازموں کے مؤثر اظہار سے عبارت ہے۔ ان انسلاکات اور تلازموں کے توسط سے ایک یکسر مختلف پیشِ منظر تعمیر ہوتا ہے۔ یہ متنوع ہے اور نیا بھی۔ بادی النظر میں کشمیر قدرتی حُسن سے مالا مال اور رنگوں کی ریل پیل کا مرکز ہے؛ جس سے مختلف قسم کے رومانی تصوّرات وابستہ ہیں۔ منظورؔ کے اشعار اور احساسات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں قدرت اور موسم مانع، سفاک اور مبارز بھی ہیں۔ منظورؔ کی شاعری اسی تضاد اور تصادم کی پیداوار اور اِسی کی آئینہ دار ہے۔

آیئے اب ایک نظر اس پیشِ منظر پر ڈالیں: برف زار، سایہ، پتھر، کالے پتھروں کے پہاڑ،

خُوں برف[۱]، ٹھٹھری ہوئی ہَوا، بُجھتے ہوئے الاؤ جیسا نیز سرد آفتاب[۲]، کانگڑی[۳]، سرو اور صنوبر کے قد آور پیڑ اور کانپتے ہوئے پتے[۴] نم، سرد، سفّاک موسم، ہوا[۵]، بند دروازے، دریچے[۶]، گھٹن، کُہر آلودہ منظر، برف سی رات، سیہ صبح، شفق، رنگ، نیلا آسمان، پھُولوں بھرے رشتے[۷]، رُوپ کے گیت، سیب جیسی صورتیں[۸]

---

۱ه خُوں برف، ہاتھ سرد، نگاہیں تمام خُون — میدانِ بے حریف کا لشکر اُداس ہے

۲ه ٹھٹھری ہوئی ہَوا مرے چہرے پہ لکھ گئی — یہ آفتاب صبح کا بُجھتا الاؤ ہے

حاصل اس ایک رنگ کا چشمِ پُر آب ہے

اب سایہ برف زار کا سرد آفتاب ہے

۳ه کانگڑی بستر میں رکھ کر کھڑکیوں کو وا کروں — برف گرنے کا کبھی میں یوں ہی نظّارا کروں

۴ه براہِ راست ہواؤں سے رَن پڑا میرا — بلند اتنا ہوں، دِن رات کانپتا ہوں میں

۵ه میں نے پُوچھا بھی ہَوا پیڑوں کی دشمن کیوں بنی — وہ یہ کہتا ہے کہ میں بس چُپ رہوں، دیکھا کروں

اُگا ہے ہر اک پیڑ پر یہ سوال — ہَوا! سب کے سب پھل تو کچّے نہ تھے!

کوئی پیام اب نہ پیمبر ہی آئے گا

وہ شب ہے آسماں سے پتھر ہی آئے گا

۶ه گُلوں نے لکھی ہیں صحرا کے نام خُوشبوئیں — ہوا پٹکتی ہے سر، بند ہر دریچہ ہے

۷ه کتنی خُوشبو دار ہوگی دُھوپ، برف آنکھوں کی ہوگی کتنی نرم

اب جو رستہ آئے گا کتنا ہے وہ پھُولوں بھرا، معلوم ہے

۸ه مجھے لگتے ہیں خوش سب سیب سورت آج بھی منظور

کہ ہیں اپنے کسی عہدِ شکستہ کا اعادہ ہوں

اب ان عوامل کے انسلاکات پر بھی توجہ فرمائیں۔ پتھر[1]: شیشہ[2]، پھول، آئینہ[3]، آذر[4]، شب: دن، دھوپ، دوپہر[5]، سائبان، ہوا؛ سایہ: دیوار[6]، پیکر؛ ہوا: آندھی، بند کھڑکی؛ شفق: رنگ، نقش، عکس؛ آنکھ: خواب، پھول، بھنورا، بستر[7]؛ پہاڑ: سمندر، موتی، صدف، شناور[8]۔

میں نے اُوپر متذکرہ تلازموں اور اُن کے انسلاکات کی محض چند مثالیں پیش کی ہیں۔ اس ضمن میں جو بات خصوصی توجہ چاہتی ہے وہ یہ کہ لفظ، تلازمہ یا اس کے انسلاک شاعر کا مقصودِ بالذات نہیں۔ حاشیئے میں درج مثالیں، جو تعداد میں کم نہیں، اس امر کا بیّن ثبوت ہیں کہ شاعر نے رعایتِ لفظی کو راہ نہیں دی اور یہ کہ متضاد معانی الفاظ کو قولِ محال میں منتقل نہیں کیا۔ اس کی توجہ چونکہ الفاظ پر نہیں، افکار و خیالات کی موثر ترسیل پر مرتکز ہے، اسی لئے الفاظ تلازموں، انسلاکات میں اور نتیجتاً اشعار اور غزلوں میں ایک عجیب شانِ تخلیق پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے معاون عوامل بصارت سے زیادہ بصیرت، مطالعے سے زیادہ مشاہدہ، علم سے بیش تجربہ

---

[1] آئینوں سے ہی فقط کد ہے کوئی لوگوں کو — ورنہ اس شہر کے پتھر بھی مثالی ٹھہرے

[2] خوشبو کا انتظار نہ کر بیٹھ کر یہاں — شیشے کے اس مکان پر پتھر ہی آئے گا

[3] کہتا ہے جھوٹ بولتے ہیں سارے آئینے — دیوانہ ہو گیا ہے وہ اپنی اداؤں کا
ہونٹوں سے میرے حرفِ شکایت ہی لے گیا — ہر آئینے سے رنگِ وضاحت ہی لے گیا

[4] باہر ہزار جشن ہے، اندر اُداس ہے — پتھر تراشتا ہوا آذر اُداس ہے

[5] بدن میں مرے دوپہر چُبھ گئی — کہ دامن میں سائے چھپائے نہ تھے

[6] اپنی دیوار ہمیشہ ہی رہے گی خالی — جب یہ صورت ہے کہ سب رنگ وبالی ٹھہرے

[7] طوفانِ رنگ، کاغذِ سادہ، قلم قلم — بھنورے کی آنکھ، پھول کا بستر اُداس ہے

[8] موتی کا کرب، موجِ تہِ آب کی گرفت — خالی صدف بدست شناور اُداس ہے

اور ماحول سے مربوط ایسے افکار ہیں، جن میں وہ اپنے قاری کو شریک کرنا چاہتا ہے۔ ترسیل کا یہ موثر انداز منظور کے اسلوب کا بنیادی وصف ہے۔ شانِ تخلیق اس کی غزلوں کا حصّہ و خاصہ ہے۔ اسی ضمن میں کشمیر کی بعض تلمیحیں[1] بھی ہماری شاعری میں ایک نئی جہت کا اضافہ ہیں۔ تاہم مناسب ہوتا اگر کسی نوع ان تلمیحوں کی نشان دہی اور سرسری وضاحت کردی جاتی، جس سے اُردو کا عام قاری ان سے کماحقہ طور پر روشناس اور لطف اندوز ہو سکتا۔

جداگانہ فکری سطح پر الفاظ کے تخلیقی استعمال کی ایک اور علامت، تجریدی[2] تمثل (Abstract Personification) ہے جو بہ یک وقت اس کے اندازِ مشاہدہ اور اسلوب کا حصّہ ہے۔ تجریدی تمثل کا یہ انداز، ممکن ہے، عام قاری کو اجنبی، کہیں نامانوس اور گاہے ناقابلِ قبول حد تک کھردرا معلوم ہو، تاہم یہ اپنے اندر بے پناہ امکانات رکھتا ہے۔

اور یہ امکانات اس مجموعے کے بیشتر اشعار سے روشن ہیں۔ مشاہدے کا یہ انداز نیا اور تازہ کار ہے۔ معانی خیز ہے۔ یہ اپنے اندر معنوی تہہ داری، گہرائی اور گیرائی رکھتا ہے۔ اسی ضمن میں ترسیل کے مختلف عوامل ـــــ اسالیبِ بیان ـــــ مثلاً سایہ تراش سورج، تیشۂ تعبیرِ آئینہ، درونِ جسم سراپا جلال، خوفِ رُخِ دشمنِ جانی، آوارہ رنگ رنگ نگاہ قیاس، منظرِ خوں عکس، طاقِ فلک کی کتاب، میدانِ بے حریف کا لشکر، منظرِ نادیدہ

---

[1] بے نظر لوگوں کے آگے ہیں برہنہ ہوں تو کیا
آنکھ والا ہو کوئی تو ڈھونڈ لوں ملبوس میں

[2] سات رنگوں کی جبیں پر وہ لکھے گا اپنا نام — جب وہ اپنے رنگ کا عکس آشنا ہو جائے گا
انجام کی سبھی کو خبر تھی، یہ صاف تھا
چھٹتی ہوئی کماں کی علامت صفوں میں تھی
جی میں آتا ہے، بچا کر آنکھ خود سے، ریت پر — دھوپ کھاتی مچھلیوں کا چھپ کے نظارا کروں

بے سکوں، لباسِ معنیٔ بے لفظ، حرفِ بے پیکر، خوئے رفاقت، سفرِ انجماد جیسی ترکیبیں اور مرکّبات نئی معنوی جہات کے حامل ہیں۔ اِن کی فضا تازہ کار ہے۔ ذہن میں تادیر قائم رہتی ہے۔

منظورؔ کے شعری مزاج پر غور کریں تو اُس کا تعقّل اور فکری رویّہ سب سے پہلے توجہ چاہتا ہے۔ یہاں اہم بات یہ ہے کہ اس رویّے کے باوجود اس کے اشعار شعریت سے عاری فلسفہ نہیں بنے۔ دو عوامل اس کے بہت کام آئے۔ ایک اعتدال؛ دوسرا، غزل کا فطری مزاج، جو ذہن کی ہر آن بدلتی ہوئی کیفیات کا فرداً فرداً احاطہ کرتا اور کسی مربوط فلسفے کا متحمّل نہیں ہوتا۔ اُس کے اشعار میں ساری اعتدال پر غور کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اجزائے ترکیبی استفسارانہ اور استفہامیہ لب ولہجہ ہیں۔ یہ دونوں ایک سوچتے ہوئے، اُلجھی ہوئی گتھیوں کو سُلجھاتے ہوئے ذہن کی دلیل ہیں۔ سوچنے اور سُلجھانے کا عمل توجّہ کے بتدریج مرکوز اور نتائج کے رفتہ رفتہ منکشف ہونے کا عمل ہے۔ اور چونکہ فکری ہے، اس لئے آہنگ اور بالخصوص بلند آہنگی سے علاقہ نہیں رکھتا۔ سوال، سوال کے جواب میں ایک یا متعدد سوال۔ یا پھر سوال کا استفہام، گاہے جواب، گاہے استعجاب، بسا اوقات ادھوری اور اَن کہی بات ہی جواب[1] ہوتے ہیں۔ اور یہ صورت بھی اپنی جگہ کسی آہنگ کی نہیں، خود کلامی

---

[1] تری طرح کوئی عکسِ خیال ہوں میں بھی — ہَوا جواب دے میرا! سوال ہوں میں بھی
رقم ہوا ہوں یقین و قیاس دونوں میں — کرے تو کیسے کرے میرا تجزیہ کوئی
یہ شہر وہ جہاں کہ حرف حرف پہ زوال ہے — زباں زباں ہے بند آنکھ آنکھ میں سوال ہے
مجھ سے یہ کہہ سکا نہ گئی رات کا سکوت — خوشبو تمام ہو کے ہَوا کیوں اداس تھی
منظر کھلا تھا کیسا دریچے کی پُشت پر — آوارہ رنگ رنگ نگاہِ قیاس تھی
میں نے پوچھا بھی ہوا پیڑوں کی دشمن کیوں بنی — وہ یہ کہتا ہے کہ میں بس چپ رہوں دیکھا کروں

جیسے زیرِلب آہنگ کی مقتضیٰ ہے۔ اس اندازِ کلام سے منظورؔ کے اشعار کی شدّت اور تاثیر دونوں میں اضافہ ہوا ہے۔ وہ ذہن میں دیر تک رہنے والا ارتعاش، دل میں ایک بے نام خلش اور احساس میں ایک کھٹک چھوڑ جاتے ہیں ——— منظورؔ کے کلام کی ایک اور خصوصیت وہ شدّت ہے جسے میں سفّاکیت کے علاوہ کسی اور لفظ سے تعبیر نہیں کر پا رہا۔ یہ سفّاکیت اُس کے اندازِ فکر میں ہے۔ یہ کشمیر کے سفّاک موسم، موسم کے بے رحم عوامل اور اُن کے بے درد اثرات کے ردِّ عمل میں پیدا ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں لہُو، قتل، قاتل، خون، خنجر، زخم، میدانِ بے حریف کا لشکر، چھٹتی ہوئی کماں، دشمن، تلوار، سُرخ آگ، ٹوٹی ہوئی کماں، سنگ زنی، اڑا ہوا سر، دشمنِ جانی، منظرِ خوں، عکس اور ایسے دوسرے الفاظ و اسالیب کو جواز کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے[1]۔ ممکن ہے یہ خصوصیّت بہ ظاہر اُوپر مذکور خصوصیّت کی نفی ہو، لیکن واقعتاً ایسا نہیں۔ یہ سفّاکیت بھی اُس کے مخصوص اندازِ اسلوب کا حصّہ بن کر پیرایۂ اظہار میں آئی ہے۔ جن اشعار میں سفّاکیت پر براہِ راست دال الفاظ[2]

---

[1] گرمی مرے لہُو میں ہے کتنی! یہ دیکھ لے — اپنی ہوس نکال کہ خنجر قریب ہے
ہے آرزو یہی کسی منصف میں مل سکے — وہ سختیٔ عمل جو مرے قاتلوں میں تھی
چُپ کی برہنگی میں خدا لگ رہا تھا وہ — الفاظ کے لباس میں خنجر تمام تھا
چلو یہ مان لیا بہہ گیا شفق کا لہُو — مگر وہ رنگ جو سُوکھے تھے، اب ہیں نم کتنے
خُوں بہا کس سے طلب ہو، کس کو قاتل مانئے — آپ اپنی سوچ ہی جب زہر کا خنجر بنے

[2] اک گرد چھائے گی ترے مومی دماغ پر — تھمنے دے آندھیوں کو ابھی کھڑکیاں نہ کھول
تکلّفات کا آئینہ دے رہا تھا فریب — بھرا ہوا تھا، دلوں میں غبار ایسا ہی
راہوں کو دے گیا ہے مسافت کا اعتبار — قدموں سے آکے خوئے رفاقت ہی لے گیا
عجیب شخص تھا! کیوں الٹے کام کرتا تھا — بدن کو سُوکھنے دیتا، وہ دل کو تر رکھتا

استعمال نہیں ہوئے، اُن کی تاثیر بھی متاسفانہ نے کی بدولت ایک عجیب کیفیت لئے ہوئے ہے۔ ایسے اشعار میں ایک بے تعلق طنزیہ کیفیت پیدا ہوگئی ہے، جو اپنی جگہ کلامِ منظور کی ایک اور خصوصیت ہے۔ اشعار کی متاسفانہ نے سے ایک دُوسری خصوصیت کا سراغ ملتا ہے: یہ کہ اُس کی شاعری اعتدال میں لائی ہوئی المیہ کیفیات کی شاعری ہے، جن کا تاثر، تا دیر قائم رہتا ہے۔ ممکن ہے یہ بڑی شاعری کی پہچان نہ ہو، لیکن یہ بڑی شاعری کے امکانات کی ضمانت ضرور ہے۔ یہاں اس امر کی طرف توجہ دلانا بے جا نہ ہوگا کہ منظور کے یہاں رومانیت برائے نام ہے۔ اور جہاں وہ رومانی ہے، وہاں رومانی سے حسیاتی زیادہ ہے۔ اسی ذیل میں ایک اور امر بھی توجہ کا محتاج ہے۔ اور وہ یہ کہ المیہ کیفیات نے اُس کے یہاں کسی مریضانہ زاجیت؛ کسی مثبت مایوسی کو راہ نہیں دی۔ اس کی شکست میں بھی ایک وقار ہے۔ جس کا تعلّی سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس کی رجائیت میں کسی مُبلّغ کی بلند آہنگی نہیں اور نہ تبلیغ کی تُندی ہے اُس کی مُستقبل سے پُر اُمیدی مذبذب اور فطری ہے۔

آخر میں منظور کی غزلوں کے ایک اور وصف کی طرف خاص طور پر توجہ دلانا چاہونگا۔ منظور کی وہ غزلیں بالخصوص زیادہ انعطاف کا باعث بنتی ہیں، جن میں اشعار، قافیے ردیف کے پابند نہیں؛ جن میں قوافی، بالعموم اسم نہیں، فعل، صفت وغیرہ ہیں اور جن میں ردیف جامد لفظ نہیں، بالتخصیص توسیعِ معانی کی گنجائشیں رکھتی ہے۔ ایسی غزلوں میں، جن کی تعداد خاص ہے، منظور کی جودتِ طبع اور شعری صلاحیتوں کے جوہر خصوصیت سے بروئے کار آئے ہیں۔ فعلیہ احساس، استفہامیہ مزاج اور اس کے نتیجے میں پیدا استعجاب اور اعتدال سے منظور کے اشعار کا آہنگ تازہ، رنگ نیا اور ڈھنگ دلکش بنا ہے۔ یہ وافر امکانات کا حامل ہے۔

مجھے یقین ہے، اردو کے سنجیدہ ادبی حلقوں میں 'ناتمام' کو بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

راج نرائن راز

# غزلیں

رقم ہوا ہوں یقین و قیاس دونوں میں
کرے تو کیسے کرے میرا تجزیہ کوئی !

○

اپنی نظر سے ٹوٹ کر، اپنی نظر میں گم ہوا
وہ بڑا باشعور تھا، اپنے ہی گھر میں گم ہوا

مرگ زدہ تھے رنگ سب آئینے پشت چشم تھے
اک وہی درد مند تھا، خوف و خطر میں گم ہوا

راستے آئینے بنے، پاؤں تمام رنگ تھے
اس پہ بھی یہ سوال وہ کیسے سفر میں گم ہوا

سوچ حواس میں نہ تھی، آنکھ حدود میں نہ تھی
پیڑ ہوا میں اڑ گئے، سانپ کھنڈر میں گم ہوا

ہر خبر اس سے تھی خبر، اور وہ بے پناہ تھا
حرف زدہ ہوا تو پھر ایک خبر میں گم ہوا

موجِ شفق سراب تھی، مرگِ نظر خیال تھا
دائرہ آب پر رہا، نقطہ بھنور میں گم ہوا

مجھ میں تھے جتنے عیب وہ، میرے قلم نے لکھ دئے
مجھ میں تھا جتنا حسن وہ، میرے ہنر میں گم ہوا

آگ جو باھر ہے پہنچے گی اندر بھی
سلئے جل جائیں گے اور پھر پیکر بھی

تیری آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے ہیں
تیرے ہاتھوں میں دیکھا ہے خنجر بھی

پارکھ ہے تو مجھ کو پرکھ ہشیاری سے
میں اک گوہر بھی ہوں میں اک پتھر بھی

خوابوں میں بھی رہتا ہوں بے چین بہت
چین نہیں ملتا ہے مجھ کو سو کر بھی

کب تک جنگ لڑے گا تیرے سورج سے
سوکھے گا اک دِن آخر یہ ساگر بھی

شفقِ شام کا دن بھر تھا ارمان مجھے
خون آلودہ نکلا ہے یہ منظر بھی

پھول کی پتّی بھی ہے بار مجھے منظور
دیکھو گے تو لگتا ہوں اِک پتھّر بھی

○

ریگِ رواں کی موج پہ خوشبو کی ناؤ ہے
یہ منظرِ عجب مری آنکھوں کا گھاؤ ہے

ٹھٹھری ہوئی ہوا مرے چہرے پہ لکھ گئی
یہ آفتاب صبح کا بجھتا الاؤ ہے

ہے گرد گرد کس لئے احساسِ نقش و رنگ
چہروں کا آئینوں سے یہ کیسا تناؤ ہے

میں آسماں کو دیکھوں حریفانہ کس لئے
اس کا بچاؤ میں ہوں یہ میرا بچاؤ ہے

باریک ہو نظر تو یہ محسوس ہو سکے
سیدھی لکیر میں بھی غضب کا گھماؤ ہے

رکھتا ہوں آنکھ وا کہ یہ احساس ہے مجھے
یہ کائنات صرف نظر کا بہاؤ ہے

کُھلتے ہیں میری آنکھ میں ہر لمحہ سات رنگ
مجھ میں وہ کون رنگ ہے، جس کا رچاؤ ہے

نُقطہ ازل سے ہے سفرِ انجماد میں
اُس کے سفر میں کیا کوئی اگلا پڑاؤ ہے

منظورؔ سوچتا ہوں کہ ہے اِس کا راز کیا
مُجھ سے مری نظر کا عجب رکھ رکھاؤ ہے

○

اس کو لے ڈوبی ہوس اپنی نشانی سے گیا
بن گیا قطرہ سمندر تو روانی سے گیا

دے جو سکتا تھا کئی رنگ کئی موڑ اسے
وہی کردار کہاں میری کہانی سے گیا

لفظ بجھتے رہے یخ بستہ خیالوں میں کہیں
ہے زباں زخم کہ میں شعلہ بیانی سے گیا

میں نے اچھا ہی کیا توڑ کے آئینے کو
اب تو میں خوفِ رخِ دشمنِ جانی سے گیا

آنکھ خوش ہے کہ کئی رنگ افق پر بکھرے
دل کا یہ زخم کہ سورج بھی جوانی سے گیا

چار نقطوں کا بھی بس کرب یہی ہے منظورؔ
ایک میں ہی تو نہیں اپنے معانی سے گیا

○

کانچ کے چہرے مگر آئینے پتّھر کے ہیں
ہم بھی اک حصہ اسی درد کے منظر کے ہیں

رنگ جتنے بھی لٹے سب مری آنکھوں کے تھے
نقش جتنے بھی کھلے سب مرے اندر کے ہیں

میں کسی ایک سے کیا جوڑ لوں رشتہ اپنا
جتنے موسم ہیں سبھی میرے مقدّر کے ہیں

اپنی پامالی و بے رنگی پہ مرتے شاید
ہم پہ احسان کئی نیلے سمندر کے ہیں

برف سی رات، سیہ صبح، سکوت صحرا
یہ سبھی کچے تصوّر کسی بے گھر کے ہیں

ہم سے کیوں دادِ شجاعت کوئی مانگے منظورؔ
ہم سپاہی کسی بکھرے ہوئے لشکر کے ہیں

○

سورج تھا برف، لُو کی تپش بادلوں میں تھی
کل دِن بھی رات ڈیرہ جمائے گھروں میں تھی

ہونے لگی ہے اب در و دیوار پر رقم
وہ خامشی جو سوئی ہوئی پتھروں میں تھی

ایسی بھی کیا نمی تھی جو دامن میں تھی مرے
کیا آگ تھی جو سوئی ہوئی آنسوؤں میں تھی

چہرے تمام رنگ تھے، باتیں تمام لفظ
کچھ بات تھی جو زخم کی صورت دلوں میں تھی

انجام کی خبر تھی سبھی کو یہ صاف تھا
چھٹتی ہوئی کماں کی علامت صفوں میں تھی

ہے آرزو یہی کسی منصف میں مل سکے
وہ سختیٔ عمل جو مرے قاتلوں میں تھی

بیتے ہوئے دلوں کی کہانی عجیب ہے
پتھر تھے سخت آگ سی نرمی گلوں میں تھی

ہم دیکھتے تھے خواب کسی برف زار پر
کیا دن تھے! جبکہ خون کی گردش رگوں میں تھی

منظورؔ آج ہی نہیں! کل بھی مری حیات
بکھری ہوئی پرانی نئی فائلوں میں تھی

ہر ایک آنکھ کو کچھ ٹوٹے خواب دے کے گیا
وہ زندگی کو یہ کیسا عذاب دے کے گیا

نہ دے سکا مجھے وسعت سمندروں کی، مگر
سمندروں کا مجھے اضطراب دے کے گیا

وہ کس لیۓ مرا دشمن تھا، جانے کون تھا وہ
جو آنکھ آنکھ مسلسل سراب دے کے گیا

خلا کے نام عطا کر کے چھاؤں کی میراث
مجھے وہ جلتا ہوا آفتاب دے کے گیا

وہ پیڑ اونچی چٹانوں پہ اب بھی تنہا ہیں
انہی کو ساری متاعِ سحاب دے کے گیا

ہر ایک لفظ میں رکھ کر سراب معنی کا
ہر ایک ہاتھ میں وہ اِک کتاب دے کے گیا

میں 'کُل' ہوں اور تُو 'جز'، میں بھی 'کُل' ہے اۓ منظور
بچھڑتے وقت مجھے یہ خطاب دے کے گیا

O

ہوں ایک وقت سے ناپختہ کار ایسا ہی
رہا ہے مجھ کو سرابوں سے پیار ایسا ہی

میں کیا سمجھ کے کہوں گا بدل گیا موسم
میں فصل فصل تھا بے اختیار ایسا ہی

اسیرِ ذات بنوں گا یہ میں نے کیا سوچا
تھا اُس کی بات کا کچھ اعتبار ایسا ہی

تکلفات کا آئینہ دے رہا تھا فریب
بھرا ہوا تھا دِلوں میں غبار ایسا ہی

مجھے خبر تھی مرے ساتھ میرا دشمن ہے
رہا میں چُپ کہ میں تھا وضع دار ایسا ہی

ہمارے شہر میں بجھتے ہیں چڑھتے سورج بس
چلا کیا ہے یہاں کاروبار ایسا ہی

خرید سکتا نہیں اس کو کوئی اے منظورؔ
دیا ہے اپنے قلم کو وقار ایسا ہی

نقش منظر میں نہیں دیکھا جو پسِ منظر میں تھا
آئینوں میں تھا فقط عکس اس کا جو پتّھر میں تھا

سب ہی مہمل کاغذی الفاظ سے کھیلا کیے
اور جو معنی تھا وہ ذہنوں کی خاکستر میں تھا

خندہ زن تھی ہر کسی پر ایک نیلی چھت مگر
ہر کوئی تھا مطمئن اس پر کہ اپنے گھر میں تھا

مجھ کو پاگل کر رہا ہے میری نظروں کا طلسم
وہ جو سائے میں نظر آیا وہی پیکر میں تھا

شورِ سرمستی تھما جب یہ حقیقت کھل گئی
اِک سسکتا سایہ ہر اک گھر کے بام و در میں تھا

یہ ہوا ٹھوکر پہ تھی جس کے، نہ جانے کون تھا
مجھ کو جس پر شک تھا وہ خود جسم کی ٹھوکر میں تھا

حادثہ یہ ہے کہ اب رقصاں مری نظروں میں ہے
وہ خدائی کا فسوں جو تیشۂ آذر میں تھا

طے نہ اس سے ہو سکا دن رات کا یہ فاصلہ
سانحہ! اس کا کہ وہ دن رات اک چکر میں تھا

جس کو دیکھا اس کی آنکھیں ساتھ اپنے لے گیا
جانے کیسا سحر اس آنکھوں کے سوداگر میں تھا

خوش نہ تھا اپنے زمینی پن سے کیوں منظورؔ وہ
اِس زمیں پر کیا نہیں تھا جو مہ و اختر میں تھا

پڑھا نہ جس کو کسی نے وہ باب ہوں شاید
کتابِ عمر! میں تیرا عذاب ہوں شاید

اُٹھا نہ تیشۂ تعبیرِ آئینہ مجھ پر
جگا نہ مُجھ کو کہ پتّھر کا خواب ہوں شاید

ہو کیسے ورنہ سمندر کو دُشمنی مجھ سے
میں دشت دشت برستا سحاب ہوں شاید

میں جسم جسم بکھر کر چُکا رہا ہوں جسے
کبھی نہ ختم ہو میں وہ حساب ہوں شاید

میں خُود کو خُود سے الگ ہو کے سوچتا کیوں ہوں
یہ جسم دشت ہے اور میں سراب ہوں شاید

نظر ملاتا نہیں ہے، اِسی لئے مجھ سے
میں تیرے خواب کا مہمل جواب ہوں شاید

زمیں کے درد کا مرکز تو تھا ہی میں منظورؔ
خلاء کا بھی سببِ اضطراب ہوں شاید

نقش جتنے بھی کھلے، سارے زوالی ٹھہرے
اب مجھے کیا، کوئی کمتر، کوئی عالی ٹھہرے

اپنی دیوار ہمیشہ ہی رہے گی خالی
اب یہ صورت ہے کہ سب رنگ وبالی ٹھہرے

اس کا کیا غم ہے کوئی بات سنے یا نہ سنے
رنج اس کا ہے کہ الفاظ زوالی ٹھہرے

وہ تھے خوش بخت وہ کر سکتے تھے کوئی بھی سوال
ہم وہ مجبور کہ خود اپنے سوالی ٹھہرے

آئینوں سے ہی فقط کد ہے کوئی لوگوں کو
ورنہ اس شہر میں پتھر بھی مثالی ٹھہرے

اس کی افسانہ طرازی بھی حقیقت ٹھہری
جو حقائق تھے ہمارے وہ خیالی ٹھہرے

حادثہ یہ ہے کہ جسموں کے خلا میں منظور
کوئی لمحہ نہیں ایسا کہ جو خالی ٹھہرے

○

سفر ہی کوئی رہے گا نہ فاصلہ کوئی
یہ اک خیال ہے، اس پر بھی تبصرہ کوئی

رقم ہُوا ہوں یقین و قیاس دونوں میں
کرے تو کیسے کرے، میرا تجزیہ کوئی

وہ دستِ سنگ ہے، میں آئینہ گرفتہ ہوں
نہ ہو سکے گا کبھی ہم میں تصفیہ کوئی

زمیں پہ آئے نہ آئے، یہ وہم ہے سب کو
خلا کی گود میں پلتا ہے حادثہ کوئی

میں اک لکیر کا قیدی ہوں، باوجود اس کے
ہر اک لکیر سے مِلتا ہے سلسلہ کوئی

نہ جانے کس لئے روتا ہوں ہنستے ہنستے میں
بسا ہوا ہے نگاہوں میں آئینہ کوئی

ہوا سُلاتی ہے دامن میں زرد پتوں کو
اسے بھی چاہیئے جینے کا مشغلہ کوئی

بھلا ہی دُور رہے اک حریف کی مانند
ہے پھر بھی سائے کا مجھ سے معاملہ کوئی

لکھا گیا نہیں منظور آج تک شاید
شفق کے باب میں صبحوں کا تذکرہ کوئی

○

خود اپنے آپ سے ملنے کا میں اپنا ارادہ ہوں
میں ہر موسم کو سہہ کر بھی ابھی تک ایستادہ ہوں

ازل سے ماورا رنگوں سے ہوں یہ میرا دعویٰ ہے
اساسِ رنگ پر جا پہنچو نہ مجھ کو نقشِ سادہ ہوں

ترا سایہ ہے، آئینہ چمکتے آفتابوں کا
میں اپنے جسم میں بے پیکری کا اک لبادہ ہوں

مجھے حیرت ہے، میں اک نقطے کی صورت کس طرح سمٹا
خلا ہے آنکھ میری، میں سمندر سے کشادہ ہوں

مجھے لگتی ہے دنیا ایک ٹھوکر اپنے پاؤں کی
میں جانے کیسی اجڑی سلطنت کا شاہزادہ ہوں

مجھے لگتے ہیں خوش سب سیب صورت آج بھی منظور
کہ میں اپنے کسی عہدِ شکستہ کا اعادہ ہوں

ٹوٹ کر بکھرے نہ سورج بھی ہے مجھ کو ڈر بہت
حبس اندر سے زیادہ آج ہے باھر بہت

مجھ کو بھی آتا ہے فن صاحب نوازی کا مگر
کیا کروں میری اَنا مجھ سے بھی ہے خودسر بہت

غم زدہ کرتی ہے مجھ کو بس دُروں بینی میری
یوں تو میں بھی دیکھتا ہوں خوشنما منظر بہت

اپنی آنکھیں گھر پہ رکھ کر بھی تماشائی ہیں لوگ
اور ان کی اِس ادا پر خُوش ہیں بازی گر بہت

اب تراشا ہی نہیں جاتا کبھی پیکر کوئی
آج بھی آذر بہت ہیں آج بھی پتھر بہت

میں کسی کی بے گھری کا کس لئے ماتم کروں
زندگی خود آج لگتی ہے مجھے بے گھر بہت

گُل پرستی پر نہ کر اصرار اے منظورؔ تُو
دیکھ ہر اک موڑ پر ہیں شہر میں پتھر بہت

کھلنے والا ہے جو منظر، کس قدر ہوگا نیا، معلوم ہے
ہے افق، خونیں شفق اور آنکھ کا کیا سلسلہ، معلوم ہے

کانپتے رہتے ہیں اس کے خوف سے بے شاخ کے پتے بہت
ہے ہوا خود اپنے اندر ورنہ کتنی بے صدا، معلوم ہے

دوپہر کی دھوپ کو پی لیں گے جب یہ تشنہ سائے شام کے
کس حقارت سے کرے گا بات پھر یہ آئینا، معلوم ہے

جانتا تھا وہ کبھی میری ہی طرح کیا ہے اساس حرف و صوت
کس لئے وہ پھر ہوا مجھ سے جدا مجھ کو یہ کیا معلوم ہے

یہ نہیں معلوم میرا سایہ مجھ سے کب ہوا پیدا مگر
حادثہ یہ ہے کہ سورج کیسے بے سایہ ہوا، معلوم ہے

کتنی خُوشبو دار ہو گی دُھوپ، برف آنکھوں کی ہو گی کتنی نرم
اب جو رستہ آئے گا، کتنا ہے وہ پھُولوں بھرا، معلوم ہے

آسماں سے آگ گرتی ہے کہ بادل بھی برستے ہیں کبھی
جس کی آنکھیں رنگ سے خالی ہوئی ہوں، اُس کو کیا معلوم ہے

کس سے اے منظورؔ اپنی نارسی کا ہم کریں کوئی گِلہ
ہم ہیں اندھی رات کے سینے پہ ثبت اک نقشِ پا معلوم ہے

○

مرا ہی حصّہ ، سیہ شب کا زندہ نغمہ ہے
کہ جنگلوں کی طرف گھر کا ہر دریچہ ہے

مجھے ڈرائے گا کیوں اُس کی وسعتوں سے کوئی
یہ کائنات مری لغزشوں کا صدقہ ہے

بہت زمانہ ہوا خُود میں گُم ہوئے مجھ کو
بہت زمانے سے بے رنگ ہر جھروکہ ہے

گلُوں نے لکھّی ہیں صحرا کے نام خوشبوئیں
ہوا پٹکتی ہے سر بند ہر دریچہ ہے

اسے گماں ہے وہی ایک تشنہ لب ہے فقط
وہ پُوچھتا ہے سمندر کہاں کا تشنہ ہے

جُھلستے سایوں کے معنی تو پوچھئے ہم سے
خُنک شبی کا فسُوں جانے کس کا حصّہ ہے

نہ جانے کس لئے منظورؔ سوچتا ہوں میں
تمام ایک حقیقت تمام دھوکہ ہے

○

مرے وجود کی دُنیا میں ہے اثر کس کا
میں جانتا ہی نہیں، ہوں میں ہم سفر کس کا

نہ مجھ پہ طنز کرو دوستو کہ بے گھر ہوں
تمہیں کہو کہ ہے تُم میں سے اپنا گھر کس کا

اس اک سوال کا سورج بھی دے سکا نہ جواب
میں صرف سایہ نہیں روپ ہوں، مگر کس کا

جو میرے پاس تھا سب لُوٹ لے گیا کوئی
کواڑ بند رکھوں اب مجھے ہے ڈر کس کا

ہر ایک شخص رہا محوِ شغلِ سنگ زنی
کسے پڑی تھی کہ دیکھے اڑا ہے سر کس کا

یہ اور بات سزا اس کو مل گئی! ورنہ
چلا ہے زور دلِ ناصبور پر کس کا

تمہاری بات الگ ہے! وگرنہ اے منظورؔ
بچا ہے اب بھی سوادِ دل و نظر کس کا

○

معصوم اس قدر کہ ستم گر تمام تھا
تھا ناتمام پھر بھی وہ منظر تمام تھا

آنکھوں کو بھی زبان نہ کرتے تو دیکھتے
صحرا کے جسم میں وہ سمندر تمام تھا

مرمر کی سِل کی طرح تھا کاغذ کا ہر ورق
موئے قلم میں تیشۂ آذر تمام تھا

چُپ کی برہنگی میں خدا لگ رہا تھا وہ
الفاظ کے لباس میں خنجر تمام تھا

وہ گرد گرد چہرے کہ نازک گلوں سے تھے
وہ آئینوں کا شہر کہ پتھّر تمام تھا

نے رن پڑا نہ کوئی مبارز طلب ہوا
غرق اپنے خوں میں پھر بھی وہ لشکر تمام تھا

کیوں ناتمامیوں کی علامت کہا گیا
وہ شخص اپنے ذہن کے اندر تمام تھا

خود ہی سے مل سکا نہ کسی موڑ پر کبھی
اوروں کے واسطے وہ میسّر تمام تھا

منظورؔ میرے ہاتھ بھی کل تک تھے زیرِ سنگ
کل تک تو میں بھی رازِ مقدر تمام تھا

آگے پیچھے اس کا اپنا سایہ لہراتا رہا
خوف سے اس شخص کا چہرہ سدا پیلا رہا

صبح کو دیکھا تو وہ مجھ سے تھا بالکل اجنبی
رات بھر جو جسم کے اندر مجھے تکتا رہا

کیسا دیوانہ تھا سب کچھ جان کر انجان تھا
ہر کسی سے وہ گلے ملتا رہا روتا رہا

یہ خطا میری تھی تجھ کو میں نے پہچانا نہیں
آئینے میں جانے مجھ کو کیا نظر آتا رہا

خود نمائی کے لئے ترکیب تھی اچھی بہت
لوگ سب خاموش تھے وہ کچھ نہ کچھ کہتا رہا

ہم نے دیواروں پہ اس کو کر دیا چسپاں مگر
اپنے گھر میں وہ بڑے آرام سے سویا رہا

سب برہنہ تن ہوئے منظور جب محفل کی جاں
اپنے گھر میں چھپ کے خاموشی سے میں بیٹھا رہا

○

ظاہراً دوست مگر دشمنِ جاں ہے کتنا
کس کو معلوم کہ سائے کا زیاں ہے کتنا

اپنی صُورت پہ نہ اِترا، یہ ذرا سوچ کبھی
آئینے میں تری آنکھوں کا دُھواں ہے کتنا

تو ہواؤں سے چُراتا ہے نظر جس کے سبب
ریگ بنیاد یہ پھُولوں کا مکاں ہے کتنا

کس بھروسے پہ کوئی نقش بناتا اُس پر
ریت کا زرد سمندر بھی رواں ہے کتنا

دیکھتا زخم کی خُوشبو کی حرارت کیا ہے
سوچتا، درد نگاہوں کا جواں ہے کتنا

دیکھنے ہی سے سبھی خوف زدہ ہیں منظورؔ
دِل کا جو رنگ ہے چہرے پہ عیاں ہے کتنا

○

عقیدے، یقیں، وہم اتنے نہ تھے
لکیروں پہ یوں لوگ چلتے نہ تھے

ہر اک اپنے پاؤں میں گُم ہو گیا
کبھی راستے ایسے سوئے نہ تھے

صدا کے سمندر میں کیسے گرے
یہ اک حادثہ ہے کہ اندھے نہ تھے

اُگا ہے ہر اک پیڑ پر یہ سوال
ہُوا! سب کے سب پھل تو کچّے نہ تھے

ہر اک زندہ انساں کو نوچا کریں
پرندے کبھی اتنے بھوکے نہ تھے

سمندر کبھی ایسا کڑوا نہ تھا
وہ جب تھا کہ جب ہم بھی پیاسے نہ تھے

خلاؤں کی بابت سُنا تھا ضرور
زمیں کے خلاء ہم نے دیکھے نہ تھے

بدن میں مرے دوپہر چُبھ گئی
کہ دامن میں سائے چھپائے نہ تھے

میں جب بات کرتا تھا، لفظوں نے جب
قلم کے معانی بتائے نہ تھے

وہ کرتے تھے مٹّی کو سونا مگر
وہ سونا تو دامن میں بھرتے نہ تھے

سراپا تھا منظور اک آگ جب
نشاں اس کے ہاتھوں کے ابھرے نہ تھے

○

وہ جو اب تک لمس ہے، اس لمس کا پیکر بنے
میری خواہش بھی عجب ہے آئینہ پتھر بنے

اک حصارِ رنگ میں بس سوچتا رہتا ہوں میں
کس طرح اندھی ہوا کی زد پہ کوئی گھر بنے

خوں بہا کس سے طلب ہو کس کو قاتل مانئے
آپ اپنی سوچ ہی جب زہر کا خنجر بنے

قتل جب تک ہو نہ سورج کا کھلے گی کیسے شام
رنگ ہی بکھرے نہ تو کیسے کوئی منظر بنے

اُس کا رشتہ ہے قلم سے اس یقیں پر استوار
نقش اب کے جو بنے شاید وہی بہتر بنے

ایک مدت سامنا خود جن کو اندھے پن کا تھا
روشنی ملتے ہی وہ آنکھوں کے سوداگر بنے

خونِ دل میں ڈوب جائے گا، تو لب پر آئے گا
جس کو اے منظورؔ میں لکھوں وہ حرفِ تر بنے

ہزار کہنہ ہو منظر لگے نیا مجھ کو
کہ روز کرتا ہے گمراہ آئینا مجھ کو

درونِ جسم بہت کچھ بٹا ہوا ہوں مگر
بچا رہی ہے بکھرنے سے اک صدا مجھ کو

نہ دیکھ نقش بہ دیوار کی طرح ایسے
میں ایسا ہوں تو صدا دے کے تُو جگا مجھ کو

نہیں ہے پاؤں تلے کی زمیں کی اُس کو خبر
مگر خلاؤں کا دیتا ہے واسطا مجھ کو

کبھی تو ایسے بھی کرلے گا اپنا نظارہ
کبھی تو مجھ سے کرے گا وہ ماورا مجھ کو

گو بے شجر ہے بہت کالے پتھروں کا پہاڑ
نہ جانے کس لئے لگتا ہے خوش نما مجھ کو

گماں سے بڑھ کے عقیدہ نہیں کوئی منظور
نئی اگر ہے کوئی بات تو سُنا مجھ کو

○

ذہنوں پر اب بھی خوف ہے لمبی عباؤں کا
انسان معتقد ہے ابھی تک گپھاؤں کا

لگتا ہے یہ لپیٹ میں لے گا انہیں کبھی
تشنہ ہے آفتاب انہی ٹھنڈی چھاؤں کا

ساحل پہ بیٹھے بیٹھے ہی بوڑھے ہوئے ہیں وہ
جو لوگ دیکھتے تھے فقط رُخ ہواؤں کا

کہتا ہے جھوٹ بولتے ہیں سارے آئینے
دیوانہ ہو گیا ہے وہ اپنی اداؤں کا

وہ چیختا ہے اور کوئی سُنتا نہیں اُسے
مدفن بنا ہوا ہے وہ اپنی صداؤں کا

ندّی کنارے اب وہ حسیں جھونپڑی نہیں
کون آ کے حُسن لُوٹ چلا سارے گاؤں کا

آتا ہے بار بار کسی جسم کا خیال
سادھو شکار ہو گیا برگد کی چھاؤں کا

اس پتّھروں کے دیس میں بہروں کے درمیان
انجام جانتا ہوں میں اپنی لواؤں کا

اُس شخص سے تو ایک بھی تنکا نہ اُٹھ سکے
ہاتھوں پر اُس کے بوجھ ہے اپنی دعاؤں کا

دل، ہاتھ، آنکھ، پاؤں، تقاضائے روز و شب
میں سوچتا ہوں بندہ ہوں کتنے خداؤں کا

منظورؔ وہ بھی لمحے گزرتے ہیں جب مجھے
لگتا ہے جیسے میں ہی ہوں خالق خلاؤں کا

○

ڈھل گیا جسم میں، آیئنے میں، پتھّر میں کبھی
چُھپ سکا میں نہ کسی رنگ کے پیکر میں کبھی

میں یہی نقطۂ موہوم رہوں گا نہ سدا
میں جھلک اٹھّوں گا آخر کسی منظر میں کبھی

وہ سمندر کی بڑائی سے ہے مرعوب کہ وہ
تشنہ لب بن کے رہا ہے نہ سمندر میں کبھی

تُجھ پہ کُھل جائیں گے خود اپنے بھی اسرار کئی
تو ذرا مجھ کو بھی رکھ اپنے برابر میں کبھی

دیکھتے ہیں در و دیوار حریفانہ مجھے
اتنا بے بس بھی کہاں ہوگا کوئی گھر میں کبھی

اصل میں کچھ بھی نہ تھا چند لکیروں کے سوا
ہم بھی رکھتے تھے یقیں حرفِ مقدّر میں کبھی

اس سے کیا پوچھتے ہم اپنے معانی منظورؔ
پھُول کِھلتے نہیں دیکھے کسی بنجر میں کبھی

کانگڑی بستر میں رکھ کر کھڑکیوں کو وا کروں
برف گرنے کا کبھی میں یوں ہی نظارا کروں

تتلیاں پر پھڑ پھڑا کر گا رہی ہوں رُوف کے گیت
ایسے میں اک سادہ پر تتلی کو میں دیکھا کروں

مجھ سے دو گز پر سدا اُونچا رہے گا آسمان
کیا ضرورت ہے کہ بے جا قد کو میں اُونچا کروں

میں نے پُوچھا بھی ہوا پیڑوں کی دشمن کیوں بنی
وہ یہ کہتا ہے کہ میں بس چُپ رہوں دیکھا کروں

جی میں آتا ہے بچا کر آنکھ خود سے، ریت پر
دُھوپ کھاتی مچھلیوں کا چُھپ کے نظّارا کروں

راستے سب گم ہوئے سب موڑ اندھے ہو گئے
جب یہ صورت ہے تو میں منظورؔ آخر کیا کروں

ا کشمیری لوک گیت

○

تیسری آنکھ کے افسوں کے اثر میں ہوگا
وہ سدا سامنے ہو کے بھی سفر میں ہوگا

منتشر اُس کے لئے میں بھی ہوں دشتِ شب میں
منتظر وہ بھی مرا شہرِ سحر میں ہوگا

چاند کو رات کی دیوار پہ روتا دیکھے
اس قدر صبر بھی کس شعلہ بسر میں ہوگا

ڈھلتے ڈھلتے اُسے بے رنگ کرے گا سورج
گر کوئی منظرِ خُوں عکس نظر میں ہوگا

اپنے قدموں سے الجھتا ہی رہے گا یوں ہی
منتشر جانے وہ کس راہ گزر میں ہوگا

ڈھونڈتے کیوں ہو اُسے جسم کے سنگستان میں
وہ تو خوشبو ہے کسی پھول کے گھر میں ہوگا

کیوں سمندر کے بلاوے کی اُسے ہو خواہش
دشت زادہ ہے سرابوں کے بھنور میں ہوگا

جس کو منظور ہو کچھ عرضِ ہنر کا احساس
اہل کوئی نہ کوئی اہلِ ہنر میں ہوگا

○

اَن گنت الفاظ، لوحِ آب پر لکھّے رہے
آنکھ کا حاصل مگر کُچھ ٹوٹتے قطرے رہے

کُچھ تو سُورج نے بھی اپنی بند مٹّھی وا نہ کی
بند کچھ ہم پر بھی اپنے دل کے دروازے رہے

راستہ بھی سانپ بن کر کینچلی بدلا کِیا
ہم بھی اپنے پاؤں پر پاؤں دھرے بیٹھے رہے

اجنبی بالکل نہیں تھی چار نقطوں کی زبان
کُھل گئی جب آنکھ ہم خاموش نقش ایسے رہے

خُود فریبی کا عمل منظور یُوں جاری رہا
ہم بھی کچھ کہتے رہے اور لوگ بھی سُنتے رہے

ہونٹوں سے میرے حرفِ شکایت ہی لے گیا
ہر آئینے سے رنگِ وضاحت ہی لے گیا

باقی ہے صرف گفت و شنیدن کا سلسلہ
الفاظ سے وہ آبِ بصیرت ہی لے گیا

راہوں کو دے گیا ہے مسافت کا اعتبار
قدموں سے آ کے خوئے رفاقت ہی لے گیا

رنگوں کی ریل پیل ہے یا وحشتِ نقوش
وہ آئینوں سے چھین کے صورت ہی لے گیا

یہ کیا ہوا کہ سارے ہی منظر ہیں کھُردرے
یہ کون ہر نظر سے نفاست ہی لے گیا

صحرا اُٹھا کے کس نے بھرے آنکھ آنکھ میں
لوگوں سے کون ان کی طبیعت ہی لے گیا

منظورؔ کوئی دے گیا لوگوں کو اپنا رنگ
پھولوں سے کون اُن کی نزاکت ہی لے گیا

نقشِ بے رنگ بنا، لفظ کی دیوار میں تھا
چھُپ کے دراصل میں خود اپنے ہی اظہار میں تھا

کس نے پھر لکھّی ہے رودادِ سفر چہروں پر
وہ اگر سویا ہوا سایۂ اشجار میں تھا

بیچتا تھا عوضِ سنگ گُلِ تر اپنے
اس کا بھی حصّہ کوئی رونقِ بازار میں تھا

ناشناسائے نوا موئے قلم کیا کرتا
رنگ سارا نفسِ خستہ کی جھنکار میں تھا

یہ نہ ہوتا تو بچا لیتا میں خود کو شاید
زہرِ اقرارِ وفا اس کے ہراک وار میں تھا

ہم سفر جس کو بنانے کی ہوس تھی مجھ کو
وہ تو مجروح مرے اپنے ہی پندار میں تھا

میں بھی تھا سنگ بدن قتل کوئی کیا کرتا
میرا قاتل تو چھپا وقت کی تلوار میں تھا

تھے فقط ہم ہی نہ ویران جزیروں میں اسیر
وہ بھی محبوس سیہ رات کے اک غار میں تھا

ایک بھی زخم مری پیٹھ پہ آیا نہ کہیں
جانے منظورؔ میں کس حلقۂ اغیار میں تھا

○

وہ نہیں تھا میں، تو پھر کس سے مری یاری رہی
لفظ سب بکھرے فقط اک خامشی طاری رہی

برف اُگلتے میں نے اُس سورج کو دیکھا مدّتوں
خواب میں بھی میرا حصّہ صرف بیداری رہی

سنگ کو آئینہ اب کرتا ہے، لیکن آج تک
گرد اس کے کس فُسوں کی چار دیواری رہی

میری بھی خواہش تھی رنگوں پر کبھی کچھ بات ہو
بیچ میں حائل نہ جانے کیسی دشواری رہی

اس ہوا سے کون سا رشتہ ہو منظور استوار
یہ ازل سے آج تک احساس سے عاری رہی

تری طرح کوئی عکسِ خیال ہوں میں بھی
ہَوا! جواب مرا دے سوال ہوں میں بھی

میں کیا سمجھ کے سمندر پہ کوئی طنز کروں
اسیرِ سلسلۂ ماہ و سال ہوں میں بھی

مجھے بھی قتل کرو میرے شہر کے لوگو
کہ اپنے ذہن سے آسودہ حال ہوں میں بھی

پرکھ رہا ہے مجھے میرے جسم سے سورج
درونِ جسم سراپا جلال ہوں میں بھی

خلا کا درد اگر اپنی بے صدائی ہے
صدا صدا تو ابھی پائمال ہوں میں بھی

یقیں کی آنکھ سے جب تک کوئی نہ سوچے گا
نہ کھل سکوں گا کہ حرفِ محال ہوں میں بھی

نہیں وہ منظرِ نادیدہ بے سکوں منظور
نظر کی قید میں اب تک نڈھال ہوں میں بھی

○

نہ بھولتا مجھے بالکل مری خبر رکھتا
برائے نام سہی دل میں کچھ گزر رکھتا

کیا ہے اُس نے بھی ظاہر مجھے بہ مجبوری
میں رنگ تھا وہ چھپا کر مجھے کدھر رکھتا

جھلک دکھا کے ہواؤں میں کھو نہ جاتا وہ
کہاں ملے گا وہ آخر کوئی خبر رکھتا

نہ جانے کیوں ہے اُسے اتنی بے گھری کی ہوس
وہاں نہ رہتا مگر اپنا کوئی گھر رکھتا

عجیب شخص تھا کیوں اُلٹے کام کرتا تھا
بدن کو سوکھنے دیتا وہ دل کو تر رکھتا

مجھے بناتا نہ سہل الحصول وہ اتنا
چھپا کے رکھتا نہ، لیکن اِدھر اُدھر رکھتا

نہ اپنی یاد کی پروائیوں کو رکھتا قید
نہ میرے سر پہ کوئی گرم دوپہر رکھتا

انہیں بھی ہوتا نہ یوں درد نارسائی کا
سمندروں میں چھپا کے نہ وہ گہر رکھتا

مری طرح وہ اگر ہوتا صاف گو منظورؔ
وہ اپنے جرم کو ہرگز نہ میرے سر رکھتا

بے سود ایک سلسلۂ امتحاں نہ کھول
سب دیکھ، دیکھتا ہی چلا جا، زباں نہ کھول

اندر کا ہی نہ ہو ذرا باھر بھی دیکھ لے
دل خوں ہے تو آنکھ پہ خونیں سماں نہ کھول

اک گرد چھائے گی ترے مومی دماغ پر
تھمنے دے آندھیوں کو ابھی کھڑکیاں نہ کھول

چھُپ جائے گا کہاں ترے حصّے کا آفتاب
اے سایہ گرد سر پہ کوئی سائباں نہ کھول

امکان ہو تو کر لے ہَوا سے مصالحت
بے فائدہ ہے! ورنہ کوئی بادباں نہ کھول

اُن سے یقیں کی دولتِ نایاب مانگ تُو
آنکھوں پہ اپنی کوئی فسونِ گماں نہ کھول

منظورؔ حرف حرف قلم کا حساب دے
لیکن فضول دفترِ سود و زیاں نہ کھول

○

حدِّ نظر تک ایک گھٹن سی یہاں پہ ہے
بادل سے کون پُوچھے برستا کہاں پہ ہے

منظر بہت حسیں ہے مگر کتنی دیر کا
ٹکڑا سفید برف کا آبِ رواں پہ ہے

فکر و نظر میں واقعی آیا ہے انقلاب
راہی نہیں ہے راستہ اب امتحاں پہ ہے

ہے مسئلہ کہ میں اسے تشبیہہ کس سے دُوں
اک تیر جو چڑھا ہوا ٹوٹی کماں پہ ہے

منظورؔ اک زمانے سے بھولے ہیں جس کو لوگ
جاری وہ حرفِ حق ابھی میری زباں پہ ہے

کوئی سبب کوئی بھی بہانہ نہ دیکھنا
پیکر میں ڈھل گیا ہے تو سایا نہ دیکھنا

احساس ایک گھاؤ ہے آنکھیں تمام زخم
شیشے کے اُس بدن کا تقاضا نہ دیکھنا

لمحوں کے سُوکھے پیڑ پہ صدیوں کا بوجھ ہے
اِک منحنی لکیر میں رستا نہ دیکھنا

اچھا ہے اپنے عکس کے رنگوں سے بات ہو
نازک ہے آئینہ اُسے تیکھا نہ دیکھنا

پتّھر کے ہونٹ موم کے الفاظ کیا کہیں
راتوں کے رُخ پہ کوئی اُجالا نہ دیکھنا

پُوچھا تھا نقش کون سا نقشِ تمام ہے
اس نے کہا کہ آنکھ کا دیکھا نہ دیکھنا

آنگن میں تُو گُلاب کا پودا اُگا تو دے
پاگل ہوا کا کیا ہے ارادہ نہ دیکھنا

اے وائے اس کا حرف نہ لانا زبان پر
اے وائے اس کا کوئی بھی رشتہ نہ دیکھنا

منظور بات اپنی اگر ہے تو پھر کبھی
کوئی سند، کوئی بھی حوالہ نہ دیکھنا

سُوکھتا جنگل اگر یہ ہے تو اس کو اک شرر دے
تو کسی صورت نظر آ، اپنے ہونے کی خبر دے

بے نمک کاغذ کو تر کرنے کی اک صورت یہی ہے
مجھ سے سب الفاظ لے جا، ایک حرفِ معتبر دے

آئینوں سے میں بہت مایوس بھی مانوس بھی ہوں
خود کو پہچانوں میں بے آئینہ بھی ایسا ہنر دے

پھر کسی دِن خوشۂ گندم اُگا دے جنّتوں میں
اِک تماشا اور کر دے، میرے سر الزام دھر دے

قید کر کے وقت کو پیکر کے محبس میں کسی دن
آفتابوں کو بجھا دے ان کو بھی کوئی سحر دے

بے صدا ہو کر رہے گی یہ ہَوا آوارہ پن سے
زرد پتّوں کا سہی لیکن اسے بھی ایک گھر دے

آرزُو ہے خالی دیواروں کے سُونے پن پہ سو کر
بے قلم کے نقش میں منظورؔ کوئی رنگ بھر دے

○

منتشر سایوں کا ہے یا عکسِ بے پیکر کا ہے
منتظر یہ آئینہ کیا جانے کس منظر کا ہے

ریزہ ریزہ رات بھر جو خوف سے ہوتا رہا
دِن کو سانسوں پر ابھی تک بوجھ اُس پتھّر کا ہے

وہ کسی فرہنگ کا قیدی نہ اب تک ہو سکا
وہ شکستہ لفظ میری روح کے اندر کا ہے

ہر کوئی ہونے لگا ہے دِن کو خوابوں کا اَسیر
خوف ہر اک آنکھ میں اِک دُور کے منظر کا ہے

دیکھ کر بھی کیا کرے منظورؔ، اس کا کرب ہے
وہ تو جزُ آنکھوں کے سر سے پاؤں تک مرمر کا ہے

○

ہے اضطراب ہر اک رنگ کو بکھرنے کا
کہ آفتاب نہیں رات بھر ٹھہرنے کا

مجسّمے کی طرح موسموں کو سہتا ہے
وہ منتظر ہے کوئی حادثہ گزرنے کا

لٹکتے سُوکھتے یہ نقش یُوں ہی روئیں گے
گزر گیا ہے جو موسم تھا رنگ بھرنے کا

وہ آئینے سے اگر ہو گیا ہے بے پروا
جواز کیا ہے اسے پھر کسی سے ڈرنے کا

گرے گی کل بھی یہی دھوپ اور یہی شبنم
اس آسماں سے نہیں اور کچھ اُترنے کا

اب آگ آگ ہے نیلے پہاڑ کا منظر
ہمیں تھا شوق بہت اس کے پار اترنے کا

اگرچہ اُس کی ہر اک بات کھردری ہے بہت
مجھے پسند ہے ڈھنگ اُس کے بات کرنے کا

دیا ہے جس نے بھی چُپ کا شراپ لفظوں کو
اسے خبر ہے ! نہیں لفظ کوئی مرنے کا

ہمیں خبر ہے ہمارے سفر کی اے منظور
تھکیں گے ہم ہی نہ ہے راستہ سنورنے کا!

ان کی زد میں جو نہیں اس سے نہیں مانوس میں
اپنی آنکھوں کی حدوں میں ہوں ابھی محبوس میں

بے نظر لوگوں کے آگے میں برہنہ ہوں تو کیا
آنکھ والا ہو کوئی تو ڈھونڈ لوں ملبوس میں

دُکھ نہیں مٹّی کے تودے کو میں سمجھا آفتاب
دُکھ ہے کم ظرفی سے اپنی کیوں نہ تھا مانوس میں

ریت کی تختی پہ گو مرقوم ہوں پائندہ ہوں
لا، سے اپنے آپ تک ہر شئے کا ہوں ناموس میں

جس کے پَر رہتے ہیں بچّوں کی کتابوں میں اسیر
جس پہ ہر صیّاد کی نظریں ہوں وہ طاؤس میں

دُھوپ تازہ ہے، خنک ہے یہ ہَوا! دریا رواں
کر رہا ہوں پھر بھی یہ کیسی گُھٹن محسوس میں

ایک لمحہ تُو مجھے مجھ سے الگ منظور سوچ
سات رنگوں کے ہر اک پیکر کا ہوں ملبوس میں

آنکھوں کے نام پر کوئی منظر بلائے گا
چھوڑے اگر ہَوا تو سمندر بلائے گا

پھُولوں میں ہو سکُون ، ملے دشت میں قرار
آئے گی یاد اپنی ! کبھی گھر بلائے گا

اُس کا مُقابلہ ہے فقط اپنے آپ سے
کس سے لڑے گا! کون سا لشکر بلائے گا

یہ آفتاب ہی سے کہے گا کہ سرد ہو
یا پھر وہ بادلوں کو زمیں پر بلائے گا

وہ یوں ہی سُن کے اَن سُنی کرتا رہے مگر
منظورؔ اُس کو یوُں ہی برابر بلائے گا!

○

مجھے مری ہی نظر کا حصار ہونا ہے
خبر نہ تھی ترا آئینہ دار ہونا ہے

ہمیں پہ ثبت ہے اک بوسہ جلتے سورج کا
ہمیں پہ سُرخ سمندر کا وار ہونا ہے

چھُپا کے رکھّو کہیں اپنے اپنے چہروں کو
ہر آئینے کو یہاں اب غبار ہونا ہے

تو خوش کہ پہنے ہوئے ہے لباس جسموں کا
ہوا! تجھے بھی خلاؤں کے پار ہونا ہے

طلسمِ خواب نہ ٹوٹے جو جاگتے دِل کا
ہمارے کرب کو بے اختیار ہونا ہے

پرند کتنی ہی اُونچی اڑان کیُوں نہ بھرے
اک اندھے ہاتھ کا اُس کو شکار ہونا ہے

اسی طرح سے جو حیراں کریں گے چوراہے
ہر ایک راہ کو بے اعتبار ہونا ہے

پھر اس کے بعد ہو کیا، جانے کون اے منظور
یہ طے ہے 'شک' کو 'یقیں' سے دوچار ہونا ہے

اور بھی کچھ دُور ہم سے آسماں ہو جائے گا
ہم کو تھا معلوم ہر منظر دُھواں ہو جائے گا

میں زباں کا ذائقہ چکھتا نہیں اس خوف سے
میرے اندر کوئی ہے جو بدگماں ہو جائے گا

سامنے رہ کر مجھے جھٹلائے گا کیا تھی خبر
وہ مرے ہی واسطے اک داستاں ہو جائے گا

سبز پتّوں کے بکھرنے تک خبر کس کو رہی
صبح سے پہلے ہی یہ سُورج دُھواں ہو جائے گا

بول اٹھیں گے کبھی خُود میرے چہرے کے نقوش
دیکھنا آئینہ اک دن بے زباں ہو جائے گا

کیسے یہ منظر اُتارا جائے کاغذ پر کبھی
دشتِ یخ سے آگ کا دیا رواں ہو جائے گا

دائروں کا رقص اے منظورؔ تھم سکتا نہیں
یہ اگر ہوگا تو نقطہ بے نشاں ہو جائے گا

○

تھی دشت کو جو آس بہت بے اساس تھی
بادل تمام آگ تھے دریا کو پیاس تھی

ہر شخص مطمئن تھا کسی کو پتہ نہ تھا
ڈھانپے ہوئے بدن کی صدا بے لباس تھی

مجھ سے یہ کہہ سکا نہ گئی رات کا سکوت
خوشبو تمام ہو کے ہوا کیوں اداس تھی

تھی بے نمک مری ہی زباں ورنہ سچ ہے یہ
نمکین پانیوں میں غضب کی مٹھاس تھی



توڑا گیا نہ اُس سے سیہ رات کا حصار
حالاں کہ روشنی کی سند اُس کے پاس تھی

منظر کھلا تھا کیسا دریچے کی پشت پر
آوارہ رنگ رنگ نگاہِ قیاس تھی

منظورؔ ڈھونڈ لاؤں گا وہ دن کہاں سے جب
بے آئینہ بھی آنکھ مری روشناس تھی

○

یہ شہر وہ جہاں کہ حرف حرف پر زوال ہے
زباں زباں ہے بند آنکھ آنکھ میں سوال ہے

جو کل بھی تھا، وہی ہے رنگ زرد آفتاب کا
نظر نظر میں کس کا خوف کس کا احتمال ہے

گھِرا ہُوا ہوں بادلوں کے اک حصار میں ابھی
ہر ایک سمت بے نگاہیوں کا ایک جال ہے

وہ آئینوں پہ وار کر کے قہقہہ لگائے گا
ہمیں سدا یہی گماں رہا کہ یہ محال ہے

عجیب آرزو ہوا کا رقص ہم بھی دیکھ لیں
زبان نقشِ سنگ کو ملے، عجب خیال ہے

نصیبِ دشمناں کہیں وہ اپنے آپ میں نہیں
کہ اس کی بات بات میں عجیب اعتدال ہے

نہ جانے کیسے رنگ گم ہیں موسموں کی آنکھ میں
بذاتِ خود یہ جاننے کی آرزو وبال ہے

وہ ایسا لفظ جو کوئی قلم ابھی نہ لکھ سکا
وہ ایسا سنگ آئینوں میں بھی جو بےمثال ہے

حروفِ 'م' 'ن' 'ظ' و 'و' 'ر' سمیٹ لو
معانیوں کو سوچ لو تو کہہ اٹھو کمال ہے

○

تھم جائے گی آندھی تو کھل جائے گا اِک منظر
اب کس سے یہ پوچھوں میں ایسا نہ ہُوا کیوں کر

اس شہر میں دونوں ہی قیمت میں برابر ہیں
اک جاگتا آئینہ ، اک سویا ہُوا پتھّر

ہر ہاتھ سے جبراً کیوں لکھواتا ہے نام اپنا
بزدل ہے وہ کیوں اتنا ، سوچا میں کِیا اکثر

صبحوں کی زمیں جیسے اک سادہ ورق کاغذ
خوابوں کے فلک پر تھے کتنے ہی مہ و اختر

بے نقش ہیں سب چہرے ، خاموش ہیں آئینے
ہنگامے گھروں میں ہیں آسیب ہیں سڑکوں پر

منظورؔ جو بے سر ہیں ، حق ان کو ہے ہنسنے کا
گھاٹے میں رہا میں ہی ، شانوں پہ اٹھا کے سر

○

عکسِ بے خانہ مقدّر اس طرح اس کا نہ تھا
جب مرا چہرہ تھا سالم، آئینہ ٹوٹا نہ تھا

نُقطے نُقطے سے اُلجھ کر نقش بے نُقطہ ہوئے
پھر ہوا آخر وہی جو حادثہ ہونا نہ تھا

قید تھے نیلے خلاؤں میں مگر معصوم تھے
منتظر تھے فصل کے گو بیج ہی بویا نہ تھا

بند ہے وہ آنکھ اب تک جس نے دیکھے ہیں وہ دن
جب مرا پیکر نہیں تھا جب مرا سایا نہ تھا

کیوں نہیں کُھلتا وہ منظر جس کا تھا اِک اپنا رنگ
یا تو وہ پیاسا نہ تھا یا سامنے دریا نہ تھا

دیکھ سکتا تھا میں جب جو کچھ پسِ دیوار ہے
اُن دنوں سورج مری آنکھوں سے یوں اُلجھا نہ تھا

ایک مدّت یک رخا ہو کر رہا منظور میں
تھا سراپا دن کہ میں نے رات کو دیکھا نہ تھا

○

باہر ہزار جشن ہے، اندر اُداس ہے
پتھر تراشتا ہوا آذر اُداس ہے

سردی کی دُھند، جسم کی تنہائیوں کا کُہر
شب کی گرفت سخت سمندر اداس ہے

خوں تشنہ شام، زورِ سیہ، زخم آفتاب
پاؤں سے سر تک آنکھ کا منظر اداس ہے

طوفانِ رنگ، کاغذِ سادہ، قلم قلم
بھنورے کی آنکھ، پھول کا بستر اُداس ہے

خوں برف، ہاتھ سرد، نگاہیں تمام خون
میدانِ بے حریف کا لشکر اداس ہے

بارِ ہوائے زرد تو سر سے اتر گیا
مقتول حرفِ شکر ہے، خنجر اداس ہے

موتی کا کرب موجِ تہہِ آب کی گرفت
خالی صدف بدستِ شناور اداس ہے

مہمل ہے اس کے واسطے ترکیبِ اعتدال
خوش سر بسر کبھی وہ سراسر اداس ہے

کیوں چیختا اڑا ہے پرندوں کا ایک جھنڈ
منظور کوئی شاخِ ثمر ور اداس ہے

○

جب سمندر زیرِ پا ہو، جسم کیوں صحرا رہے
اس سے جو صرفِ نظر کر لے وہی اچھا رہے

لوگ بے موسم ہوئے ہیں صرف اتنا سوچ کر
آنے والا ہے جو موسم جانے وہ کیسا رہے

میں نے دیکھا ہے کہ ہے ٹھہراؤ میں حرکت نہاں
منجمد چشمے[1] سے اک دریا سدا بہتا رہے

دوسرا رستہ کوئی ہے ہی نہیں بے بس ہے وہ
رنگ میں ڈوبے تو کیسے آنکھ سے چھپتا رہے

کوششِ بسیار کے باوصف میں سمجھا نہیں
جس کا دل روتا نہیں وہ کس لئے ہنستا رہے

جلتی آنکھوں کا ہے اے منظورؔ مدت سے نصیب
ایک ایسا عکس ہر موسم میں جو جلتا رہے

[1] چشمۂ ویری ناگ سے جہلم کا بہنا۔

موسم کے رویّہ سے پریشان نہیں ہوں
یہ کیسے کہوں، میں کوئی بےجان نہیں ہوں

ہر صبح نئے دن کو نیا خواب دیا ہے
میں وقت سے ہارا ہوا انسان نہیں ہوں

کیا ہے پسِ الفاظ مجھے اس کی خبر ہے
کاغذ کی حرارت سے میں انجان نہیں ہوں

مشکل نہیں اتنا کہ کوئی بھی نہ سمجھ پائے
سمجھیں مجھے سب اتنا بھی آسان نہیں ہوں

مہتاب کی ہر شوخ کرن مجھ سے ہے گویا
ہر چند مَیں خاموش ہوں سنسان نہیں ہوں

منظورؔ نہیں ہوں کوئی بے چہرہ مَیں لیکن
آئینے کا شرمندۂ احسان نہیں ہوں

○

پتھر پہ پھول کاڑھ کے کیا کام کرگیا
وہ شخص شہرِ سنگ کو بے نام کرگیا

ہر ایک زرد آنکھ میں خنجر اُتار کر
وہ جلتی دوپہر کو خنک شام کرگیا

اب میں ہوں اور ایک سنہری کمان ہے
اس بھاگتے ھرن کو کوئی رام کرگیا

وحشت زدہ زمین اسے ڈھونڈتی ہے اب
ہر اچھی بات کو جو اک الزام کرگیا

اِک رازِ مشترک تھا ترے میرے درمیان
ہے کون تیسرا جو اُسے عام کرگیا

وہ منحنی یقین مرا لا کے دو مجھے
آئینہ مجھ کو تابعِ اوہام کر گیا

کیا اس کے جی میں آئی خلاؤں کے شہر میں
اک نام دے کے مجھ کو وہ بدنام کر گیا

منظور حرف حرف کو اس کی تلاش ہے
وہ جس کو آشنائے 'الف لام' کر گیا

کوئی بھی بات کرے خود کو ٹوکتا ہوں میں
یہ کرب کیا ہے کہاں خود بھی جانتا ہوں میں

غموں کے باٹ سے چھنتے ہوئے ترازو میں
مسرّتوں کے سمندر کو تولتا ہوں میں

عجب طرح کا اذیّت پسند ہوں میں بھی
تمام رات ہواؤں سے بولتا ہوں میں

یہ کیسا سحر ہے جُڑتا ہوں صبح کو ہر روز
یہ کیا فسوں ہے کہ ہر شب کو ٹوٹتا ہوں میں

ملیں تو جوڑ کے لکھوں گا تم کو کاغذ پر
تمہارے نام کے حرفوں کو ڈھونڈتا ہوں میں

براہِ راست ہواؤں سے رن پڑا ہے مرا
بلند اتنا ہوں دن رات کانپتا ہوں میں

کوئی سُنے مُجھے ممکن نہیں، مگر منظور
اب اپنے جسم کے اندر ہی گونجتا ہوں میں

○

پیادہ ہو کے بھی کسی سے وہ سوار کم نہ تھا
اُسے بھی اپنے اس گماں پہ اعتبار کم نہ تھا

کِرن کِرن تھی تشنہ قطرہ قطرہ آب خشت تھا
کہ دیکھ کر یہ آفتاب بے قرار کم نہ تھا

نہ صرف یہ کہ راستے ہی بے یقیں لکیر تھے
مری نظر میں بھی شکوک کا غبار کم نہ تھا

وہ اپنے سر پہ تہمتیں اُٹھا کے چل دیا مگر
ہَوا کے لوٹنے کا اُس کو انتظار کم نہ تھا

وہ کس طرح کے لوگ تھے جنہیں خبر نہ ہو سکی
حصارِ جسم سے نگاہ کا حصار کم نہ تھا

○

خُود آپ اپنے واسطے آزار بن گیا
میں بکھری خوشبوؤں کا خریدار بن گیا

خاموشیوں کے زرد تکلّم کے ڈر سے وہ
اک اَن سُنی صدا کا طرفدار بن گیا

موجِ شفق لہو کی طرح کیوں رواں نہ ہو
سُورج تمام درد کا انبار بن گیا

دِل میں اُتر رہا ہے کھُلی آنکھ کا فسُوں
خوابیدہ نقش منظرِ بیدار بن گیا

موجِ ہوا کا رقص میں دیکھوں تو کِس طرح
آئینہ میری آنکھ کی دیوار بن گیا

نقطے میں قید تھا تو مری فہم میں نہ تھا
کھلنے لگا تو اور پُر اسرار بن گیا

پوُجا گیا ہے اِتنا کہ یہ حادثہ ہوا
وہ خوُد بھی آپ اپنا پرستار بن گیا

منظوؔر بے جہت کے سفر کے عذاب میں
ہر نقشِ راہ باعثِ آزار بن گیا

ورقِ شب پہ مجھے دِن کا اندھیرا لکھّے
دِل جو کچھ دیکھے اُسے آنکھ تماشا لکھّے

رشک آتا ہے مجھے خُود پہ کہ دِن رات ہَوا
ریگ زاروں پہ مجھے صورتِ دریا لکھّے

میری تفسیر بھی ہے یہ مری تکذیب بھی ہے
رنگ کو عکس لکھے جسم کو سایا لکھے

بحث بے سُود ہے مجھ سے ابھی آئینہ گرد
جانے سُورج مرے چہرے پہ ابھی کیا لکھّے

وقت بے چہرہ بھی ہے، صرف یہ رم خوردہ نہیں
اس میں کیا رنگ بھرے کوئی اِسے کیا لکھّے

اُس کی ضد کا نہ دیا جائے کبھی مجھ سے جواب
اپنے معنی نہ کہے لفظ کو، اندھا لکھّے

ہوں فرستادۂ گُل سنگ سے نسبت کیا ہو
یہ ہے منظور تو غم کیا ہے کوئی کیا لکھّے

○

ہے خوش بہت کہ اس سے بھی اک کام ہو سکا
وہ کچھ نہیں تو نیم کے پودے ہی بو سکا

کھلتا نہیں ہے دِل کی زمیں پر بھی کوئی رنگ
اندر کی تیرگی کو یہ سُورج نہ دھو سکا

جرأت نہیں وہ اپنے ہی دِل کا رہا حریف
جرأت یہ ہے وہ خُود کو لہو میں ڈبو سکا

خود بھی وہ بے خبر تھا کہ کیا بات اس میں تھی
وہ اِک ہجوم میں بھی کہیں کیوں نہ کھو سکا

اُچھلا ہے اپنی تہہ سے سمندر ہزار بار
اک بار بھی نہ چاند کا دامن بھگو سکا

منظورؔ آئینے کا تماشا عجیب ہے
میرا ہی ہو سکا ہے نہ اپنا ہی ہو سکا

○

تخاطب مرا اس دلاور سے ہے
جو مصروف خود اپنے اندر سے ہے

مری پیاس پر طنز کرتے ہو کیوں
مرا کوئی رشتہ سمندر سے ہے

ہر اک اپنے قد میں ہے سمٹا ہوا
یہ شکوہ فقط اس قدآور سے ہے

اُسے کیا غرض جاگے کب آفتاب
جو نامطمئن اپنے پیکر سے ہے

سزا اور کچھ سوچ میرے لئے
کہ پہچان ایک ایک پتھر سے ہے

کھڑے پیڑ کو کس نے سوچا کبھی
کہ یہ کھوکھلا کتنا اندر سے ہے

مجھے اِک زمانے سے ہے واسطہ
مرا رابطہ غم کے دفتر سے ہے

بہایا ہے کتنا لہو رات نے
عیاں صبح کے زرد منظر سے ہے

نظر مجھ سے کہتی ہے منظور یہ
مرا بھی کوئی رشتہ آذر سے ہے

اگر نہ آنکھ سے دِل تک یہ فاصلا ہوگا
خُود آپ اپنا وجُود ایک مسُلا ہوگا

میں آفتاب کے کرتب سے خوب واقف ہوں
شجر کہ سوکھ گیا ہے ابھی ہرا ہوگا

اُداسیوں کا ہر اِک بام و در پہ پہرہ ہے
نظر بُجھا کے چلو ورنہ جانے کیا ہوگا

سلیقہ آئے گا جب مُجھ کو جانچنے کا اُسے
وہ چھُپ کے رنگ میں تصویر بن چکا ہوگا

نقوش بکھرے پڑے ہیں اس آنکھ میں منظورؔ
نہ جانے اُن میں مرا نقش کون سا ہوگا

○

خلا ہی پاؤں کے نیچے خلا ہی ہے سر پر
لگی ہوئی ہیں نگاہیں عجیب منظر پر

نہ کھو کھلا یہ کہیں ہو گیا ہو اندر سے
جمی ہوئی ہے عجب گرد سی سمندر پر

یہ آفتاب ہر اک رنگ لُوٹ لیتا ہے
یہ ٹوٹ پڑتا ہے یادوں کے لاؤ لشکر پر

کبھی وہ مجھ سے گریزاں کبھی میں اس سے جدا
ہُوا نہ اس سے کوئی فیصلہ برابر پر

رکھے گی تشنہ ہمیشہ مری انا مجھ کو
ٹھہر سکے گا نہ پانی کہیں بھی پتھر پر

شعورِ وقت جھٹک دے تو کوئی بات بنے
کہ نیند آتی ہے کم خاردار بستر پر

یہ سوچتا ہوں تو ہوتا ہوں خُوش بہت منظورؔ
کہ ایستادہ ہے یہ آسماں مرے سر پر

○

زمیں کے گرد میں سورج کو گھومتا دیکھوں
میں منتظر ہوں کہ منظر کوئی نیا دیکھوں

کروں میں جسم کی دیوار پر یقیں کوئی
کہ اپنے جسم میں پھیلا ہُوا خلا دیکھوں

ہر ایک لمحے لکیروں کو جاگتے دیکھا
میں اپنی آنکھ کو بھی کاش جاگتا دیکھوں

ترے ہی لمس سے سیراب ہے بدن میرا
تجھے کہاں مگر اے موجۂ ہوا دیکھوں

سمندروں کا نہ لکھوں میں مرثیہ کیوں کر
دہکتی آگ کو جب خود سے کھیلتا دیکھوں

اِس آفتاب سے اس دن مصالحت ہوگی
میں اپنے رنگ میں جب اس کو ڈوبتا دیکھوں

بگاڑتا ہے، بناتا ہے، توڑتا ہے مجھے
ذرا یہ کہہ میں تری کون سی ادا دیکھوں

شکست و ریخت کے اس دَور میں مجھے منظور
نہیں یہ ہمتِ بے جا کہ آئینا دیکھوں

حاصل اُس ایک رنگ کا چشمِ پُر آب ہے
اب سایہ برف زار کا سرد آفتاب ہے

اک لمحہ مجھ کو سوچ مری ذات سے الگ
کیا میری وسعتوں کا سمندر جواب ہے!

جو آسکا نہ آج تک آنے کے باوجود
پھُولوں کی آرزو اُسی موسم کا خواب ہے

یا گر پڑے زمین پہ یا میرا قد بڑھے
میرا وجود طاقِ فلک کی کتاب ہے

احساس کس کو ہے کہ مری جلتی آگ پر
اک طنز کی طرح یہ برستا سحاب ہے

سایوں کے گھٹنے بڑھنے سے منظور خوش ہے وہ
لیکن مرے لئے یہ تماشا عذاب ہے

○

مری نظر میں ہیں پوشیدہ پیچ و خم کتنے
ہوئے ہیں عکس اک آئینے میں بہم کتنے

چلو یہ مان لیا بہہ گیا شفق کا لہو
مگر وہ رنگ جو سوکھے تھے اب ہیں نم کتنے

نہ جانے کیا ہو اگر یہ پتہ چلے مجھ کو
مرے وجود میں بیدار ہیں عدم کتنے

یہ کون پوچھے گا سایہ تراش سورج سے
خود اس کے جسم میں سائے ہوئے ہیں ضم کتنے

ہے شرط آنکھ کرے ان کو منعکس دل پر
نقوش نیلے خلاؤں میں ہیں رقم کتنے

ہزار صدیوں سے محوِ سفر ہوں اے منظور
میں سوچتا ہوں چلا ہوں مگر قدم کتنے

○

آپ اپنے سے مگر برسرِ پیکار جو تھا
اس پہ کیا کرتا کوئی وار خبردار جو تھا

دیکھتا کیوں نہ ہراک رنگ حریفانہ مجھے
یں کہ اِک منظرِ بیدار کا اظہار جو تھا

حرف رکھتا کوئی کیوں حسنِ نظر پر اپنے
دیکھتا کون اُسے نقش بہ دیوار جو تھا

قتل ہونا تھا بہر حال اُسے ، قتل ہُوا
کِس طرح بچتا وہ رنگوں کا خریدار جو تھا

کیسے طے کرتا کہ یہ فاصلہ تھا صدیوں کا
سامنے آتا کہاں جسم کے اس پار جو تھا

بولتا کیا میں سراپا تھا برہنہ گفتار
پوچھتا کیا وہ ہر اک زخم نمودار جو تھا

اب سمٹ کر وہی آئے گا گھروں میں شاید
ایک ہنگامہ کہ کل برسرِ بازار جو تھا

میں ہی کم فہم تھا، غم مجھ کو رہا جو اس کا
سائے کو ٹوٹنا تھا باعثِ آزار جو تھا

ہم وہیں پر ہیں ابھی پہلے جہاں تھے منظور
راستہ اندھی ہواؤں کا طرفدار جو تھا

○

چھوڑ کر مجھ کو کہیں پھر اُس نے کچھ سوچا نہ ہو
میں ذرا دیکھوں وہ اگلے موڑ پر ٹھہرا نہ ہو

میں بھی اک پتھر لیے تھا بزدلوں کی بھیڑ میں
اور اب یہ ڈر ہے اُس نے مجھ کو پہچانا نہ ہو

ہم کسی بہروپیے کو جان لیں مشکل نہیں
اس کو کیا پہچانیے جس کا کوئی چہرا نہ ہو

اُس کو الفاظ و معانی کا تصادم کھا گیا
اب وہ یوں چُپ ہے کہ جیسے مدتوں بولا نہ ہو

دندناتا یوں پھرے ہے شہر کی سڑکوں پہ وہ
جیسے پورے شہر میں کوئی بھی آئینا نہ ہو

لوگ کہتے ہیں ابھی تک ہے وہ سرگرمِ سفر
مجھ کو اندیشہ کہیں وہ راہ میں سویا نہ ہو

مجھ کو اے منظورؔ یوں محسوس ہوتا ہے کبھی
جیسے سب اپنے ہوں، جیسے کوئی بھی اپنا نہ ہو

○

کہر آلودہ نظر رنگ سے بھر جائے گی
برف پگھلے گی کبھی، دھوپ کبھی پھیلے گی

پُوچھ لیتا ہیں ہوا سے ترا مسکن کیا ہے
یہ بتائے گی، مگر، جاں کا صلہ مانگے گی

سطح بے آب سمندر کی ہے ترکیب عجب
نہ لکھی جائے قلم سے تو زباں لکھے گی

رنگ کی بات نہ کر رنگ تو ٹھہرے گا کہیں
بات ہے آنکھ کی ٹھہری نہ کہیں ٹھہرے گی

بے سبب بولتی آنکھوں کو جلاتا کیوں ہے
رات بولی ہے کبھی پہلے نہ اب بولے گی

زرد پتّوں کی صداؤں کا فسوں ٹوٹے گا
راہِ بے سایۂ اشجار کبھی جاگے گی

آج یک رنگ سے چہروں میں بھلے ہی کھو جاؤں
کل کی دُنیا مجھے منظور مگر سوچے گی

ہے یہ مُمکن لمحہ دو لمحہ ہمیں کچھ سوچنا ہو، دیکھنا
کاغذی دیوار پر کچھ کالے حرفوں میں لکھا ہو، دیکھنا

اک نئی تصویر میرے گھر کی دیواروں پہ اُبھری رات کو
میرے ہمسائے نے اس بارے میں شاید کچھ سُنا ہو، دیکھنا

ماورا آنکھوں سے کوئی شے نہیں ہے جسم میں ضد اُس کی تھی
وہ نئے انداز سے اس مسئلے پر سوچتا ہو، دیکھنا

تشنہ، آہن پوش، تیغ بستہ بریدہ سر یہ لمبا راستہ
یہ بھی اپنے وقت کا بہتا ہوا دریا رہا ہو، دیکھنا

اگلی نسلوں کے لئے منشور جو لکھا گیا ہے ریت پر
اس کو لے اڑنے کے درپے پھر کہیں پاگل ہوا ہو، دیکھنا

بے صدائی کے سیہ ہاتھوں سے پھر آزاد ہوگا وقت کب
کچھ نہ کچھ اس پر بھی ان موٹی کتابوں میں لکھا ہو، دیکھنا

آج پھر سورج مُکھی کے پھول سے سورج نے اس کے کان میں
اپنی گردش کا نیا کوئی فسانہ کہہ دیا ہو، دیکھنا

ہو گیا ہو حادثہ بچوں کے اسکولوں میں جاکر ایک دن
لام الف پھر اپنی تختی پر کسی نے لکھ دیا ہو، دیکھنا

کاروبارِ لفظ میں منظورؔ آخر اپنی خاطر ایک دن
تیری عزت شہر میں کیا ہے ذرا یہ دیکھنا ہو، دیکھنا

○

کوئی پیام اب نہ پیمبر ہی آئے گا
وہ شب ہے، آسمان سے پتھّر ہی آئے گا

جا کر وہ اپنے شہر سے اُس کو یقین ہے
پانی پہ کوئی نقش بنا کر ہی آئے گا

اتنا بدل گیا ہوں کہ پہچاننے مجھے
آئے گا وہ تو خود سے گزُر کر ہی آئے گا

بے در کا اِک مکان رُلاتا ہے رات دن
اُس کے بھی دِل جو ہوگا کبھی بھر ہی آئے گا

کیا سوچ کے گیا ہے خلاؤں کی سیر کو
اب کے پرند ٹوٹ کے بے پر ہی آئے گا

خُوشبو کا انتظار نہ کر بیٹھ کر یہاں
شیشے کے اس مکان میں پتھّر ہی آئے گا

پتّھر کوئی فضا میں معلق رہے گا کیُوں
منظورؔ طے ہے یہ کسی سر پر ہی آئے گا

تمام کرب ہے اظہار اس صداقت کا
شکار ہوں میں کسی بے طلب عنایت کا

تری صدا کو میں دل میں اُتار لوں کیسے
اسیر ہوں میں ابھی تک خود اپنی چاہت کا

میں دستِ سنگ کی پنہاں لکیر کیوں نہ بنوں
مری نظر ہے ابھی عکس اپنی وحشت کا

ہوا کو سونپ سکوں گا نہ کربِ ذات اپنا
میں غم اُٹھا نہ سکوں گا تمہاری وحشت کا

ہے میرے سامنے اک شاہکار سی تصویر
میں اک سوال ہوں رنگوں کی اس حراست کا

کتابِ پیکر و سایہ کو دیکھنے والو
پڑھو مجھے کہ معانی ہوں لفظِ حیرت کا

تڑپ رہا ہوں میں شورِ نشور میں منظورؔ
سکوت چھایا ہوا ہے یہ کس قیامت کا

سرد، اکتا دینے والی زندگی
زندگی کی ہے سوالی زندگی

کیوں نہ اپنے گھر اُسے میں لے چلوں
ہے سڑک پر اِک نرالی زندگی

اس کو چھو سکتی نہیں اب سُرخ دُھوپ
قید ہے کمروں میں کالی زندگی

پی گیا ہے اپنی گرمی آفتاب
برف ہے نازوں کی پالی زندگی

چھانتی ہے سب کو پانی کی طرح
جیسے ہے باریک جالی زندگی

ہو رہا ہے خشک جڑ سے پیڑ پیڑ
جھومتی ہے ڈالی ڈالی زندگی

فکر کیوں ہو اس کی اے منظور پھر
جب ہَوا کو سونپ ڈالی زندگی

○

ایسا لگتا ہے کہ آنکھوں کا دھواں کھُلنے لگا ہے
ہو منادی ہم پہ نیلا آسماں کھُلنے لگا ہے

یہ نیا منظر تراشیدہ ہے سیمابی منظر کا
ریگ کی کشتی پہ بھی اب بادباں کھلنے لگا ہے

اب کہیں آنکھوں سے اُس کے ذہن تک سب خُوں ہی خُوں ہے
اب کہیں اُس شخص کا رنگِ بیاں کھُلنے لگا ہے

رنگ اترے ہیں تو چہرے سادہ کاغذ ہو گئے ہیں
دُھوپ نکلی ہے تو سایوں کا زیاں کھُلنے لگا ہے

بکھری یادوں کی نئی ترتیب بے مطلب نہیں ہے
زخم تو چُپ ہے مگر اس کا نشاں کھُلنے لگا ہے

بیٹھے بیٹھے آج دِل کے دُھوپ خانے میں یہ مجھ پر
کون سی سوچوں کا رنگیں سائباں کھُلنے لگا ہے

عافیت منظورؔ صاحب شہر میں ممکن نہیں اب
بھاگ جاؤ سحرِ خاموشی یہاں کھُلنے لگا ہے

○

سفر میں محو بھی ہے اور تھکا ہوا بھی ہے
کہاں رُکے گا وہ یہ کوئی جانتا بھی ہے

یہ سچ کہ اپنے ہی سائے کو پوجتا ہوں میں
میں جس کو اپنا کہوں کوئی دوسرا بھی ہے

تکلّفات کی سرحد پہ ہم کھڑے ہیں ابھی
وہ اجنبی بھی ہے مجھ سے وہ آشنا بھی ہے

کھُلا ہے مجھ پہ کہ ظاہر پرست ہے وہ بھی
مرا خیال تھا مجھ کو وہ سوچتا بھی ہے

یہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں زندانی
یہاں سے بھاگ نکلنے کا راستہ بھی ہے

وہی خلوص و مروّت کا نوحہ خواں بھی ہے
وہی خلوص و مروّت کو بیچتا بھی ہے

کسی کو ڈھونڈنے سے پہلے یہ بتا منظور
خود اپنے آپ کا تجھ کو کوئی پتا بھی ہے

○

چھوڑ کر بارِ صدا وہ بے صدا ہوجائے گا
وہم تھا میرا کہ پتھّر آئینہ ہوجائے گا

میں بڑا معصوم تھا مجھ کو خبر بالکل نہ تھی
میرے چھو لیتے ہی وہ میرا خدا ہوجائے گا

دائرہ در دائرہ ہے سبز جنگل، سُرخ آگ
کب ہَوا جاگے یہ منظر کب ہَوا ہوجائے گا

بے مروّت راستوں سے بے خبر شاید ہے وہ
پھر کہیں پر میرا اس کا سامنا ہوجائے گا

سات رنگوں کی جبیں پر وہ لکھے گا اپنا نام
جب وہ اپنے رنگ کا عکس آشنا ہوجائے گا

آفتاب اس راز سے نا آشنا شاید نہیں
قیدِ محور سے کسی دن یہ رِہا ہوجائے گا

ہاتھ میں لے کر قلم منظورؔ یہ سوچا نہیں
کارو بارِ لفظ میں کیا فائدہ ہوجائے گا

○

خُود اپنے لئے طنز کا سامان بہم کر
تو اپنی حکایات سمندر پہ رقم کر

آنکھیں ہی نہیں ہاتھ بھی رکھتی ہیں ہوائیں
بے بس ہے تو بے فائدہ پتّوں کا نہ غم کر

وہ شخص بہادر تھا کہ بے حِس تھا کہے کون
تنہا تھا مگر لڑتا رہا دُھوپ سے جم کر

سڑکیں کسی اژدر کی طرح رینگ رہی ہیں!
لوگوں کے قدم اپنے ہی پاؤں میں ہیں تھم کر!

خُود اپنی ہی خاطر کوئی پہچان مری رکھ
ہر چہرہ مرے چہرے میں اس طرح نہ ضم کر

گفتار ہے اس شہر میں الفاظ کا اِسراف
منظور مری مان زبان اپنی قلم کر

رُک گئے ہیں سبھی نقطۂ ذات پر
طنز کیسے کرے کوئی حالات پر

خُود سے بڑھ کر یقیں آئینے پر مرا
حق سے بڑھ کر بھروسہ حکایات پر

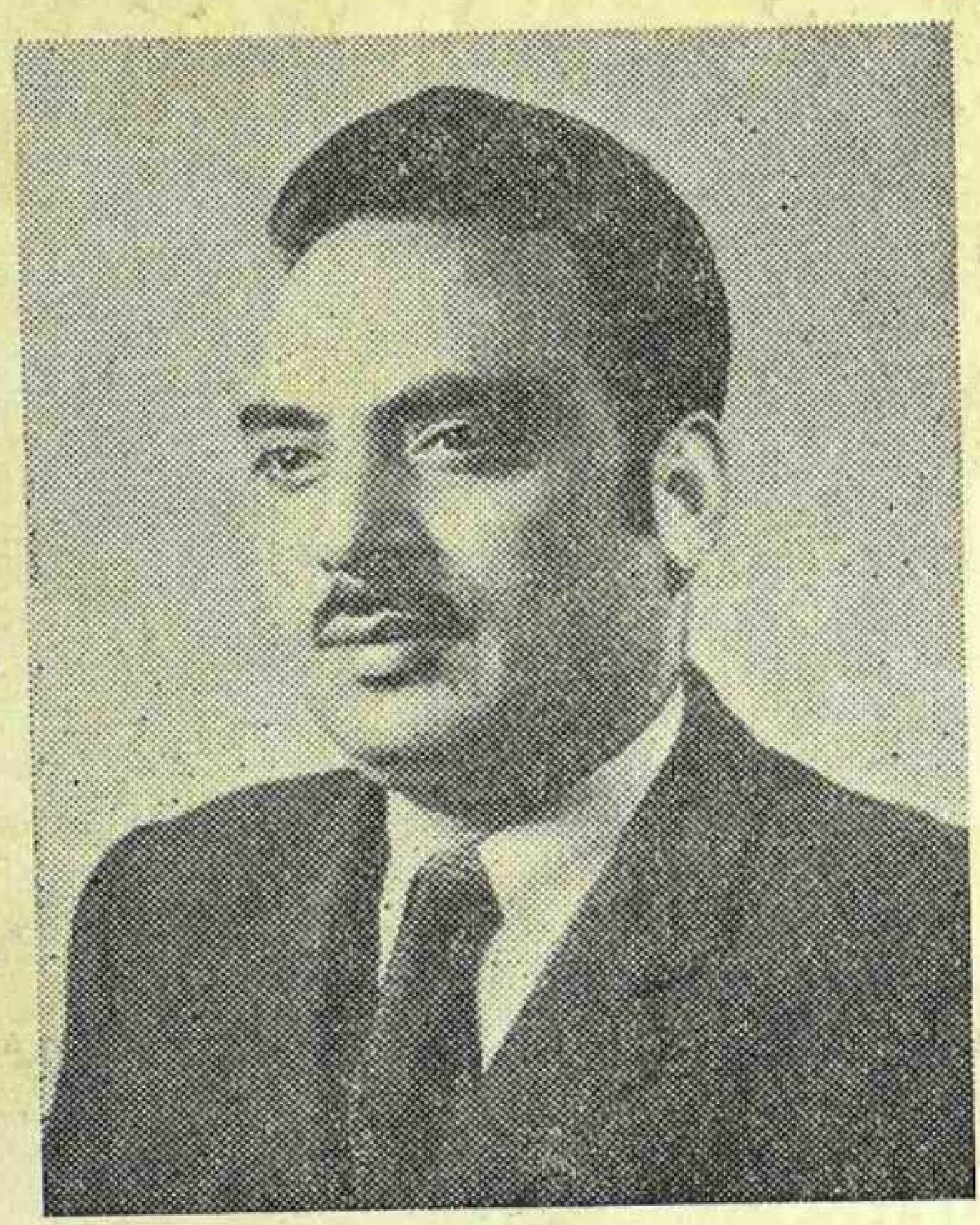
برف کے جسم میں آگ کی روح ہے
کون ایمان لائے مری بات پر

اب ہے پاتال پاؤں تلے کی زمین
اب ہے سورج کھڑا صرف دو ہات پر

یوں ہتھیلی پہ سورج لگاتا نہ پھر
کر نظر اپنے اندر کے ظلمات پر

جب ہَوا لے اڑی پیکرِ رنگ کو
وقت حاوی ہُوا سب کی اوقات پر

کیا گزرتی ہے منظور اس شوق میں
لکھ رہا ہوں میں صدیوں کو لمحات پر



حکیم منظور کی غزلوں کا انتخاب کرتے وقت میں اُن کے تخلیقی جوہر سے بے حد متاثر ہوا۔ اُن کے کلام میں فکر اور جذبہ کی ہم آہنگی موثر اظہار کی راہ نکالنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اُن کا شعری احساس کشادہ منظری اور دُروں خبری سے عبارت ہے۔ آج کے دَور میں لکھی جانے والی ہم اسلوب غزلوں کے درمیان اُن کی غزل تازہ ہوا کی طرح محسوس ہوئی۔ متجسس اندازِ مشاہدہ، الفاظ کو برتنے کا منفرد زاویہ، ڈکشن کی تازہ کاری، یہ سب کچھ اُن کے یہاں ایک نیا اسلوب ترتیب دیتا ہوا نظر آتا ہے مجھے یقین ہے کہ نئی غزل کے منظر نامہ میں اُن کی غزل کا نقش آسانی سے تلاش کیا جا سکے گا۔ اُن کی حرکی شعریات میں غزل کی امکانی قوتوں کا سراغ لگایا جا سکتا ہے ۔

منظور، بات اپنی اگر ہے تو پھر کبھی
کوئی سند، کوئی بھی حوالہ نہ دیکھنا

بانی